UNIVERSAL
LIBRARY

OU_222743

UNIVERSAL
LIBRARY

Checked 1965
Checked 1978
CHECKED 1965
Checked 1969

مقدمہ

جہاں سے دیکھئے یک شعر شور انگیز نکلے ہے
قیامت کا سا ہنگامہ ہے ہر جا میرے دیوان میں

میر تقی میر سرتاج شعرائے اردو ہیں اُن کا کلام اسی ذوق و شوق سے پڑھا جائیگا جیسے سعدی کا کلام فارسی زبان میں۔ اگر دنیا کے ایسے شاعروں کی ایک فہرست تیار کی جائے جن کا نام ہمیشہ رہے گا تو میر کا نام اس فہرست میں ضرور داخل کرنا ہوگا … اُن لوگوں میں نہیں ہیں جنہوں نے موزونی طبع … یا اپنا دل بہلانے کی خاطر یا دوسروں سے تحسین سننے کو شعر کہے ہیں، بلکہ یہ اُن لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے … کی فصاحت کو چمکایا اور زبان کو زندہ رکھا۔ شاعری تو … کی زندگی کا جزو تھی گویا فطرت نے انھیں اسی سانچے … ڈھالا تھا ان کا احسان اردو زبان پر تا…

اور اُن کے کلام کا لطف کبھی کم نہ ہوگا

جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز

تاحشر جہاں میں مرا دیوان رہیگا

میر صاحب جیساکہ خود انھوں نے اپنے تذکرے نکات الشعرا میں لکھا ہے "متوطن اکبر آباد است بہ سبب گردش لیل و نہار از چندے در شاہجہاں آباد است" علی ابراہیم کے تذکرہ گلزار ابراہیم میں جس کا ترجمہ میرزا علی لطف نے مسٹر جان گلکرسٹ کی فرمائش سے اردو میں کیا یہ لکھا ہے کہ "میر تخلص، نام نامی اُس نگین خاتم سخن افرینی کا میر محمد تقی ہے متوطن اکبر آباد کے سراج الدین علی خاں آرزو تخلص آپ کے کچھ رشتہ داروں میں دور کے تھے ابتدائے سن شعور سے پرورش انھوں نے دار الخلافہ شاہ جہاں آباد میں پائی ہے، اور خان مذکور کی صحبت سے نظم ریختہ کی کیفیت باریکیوں کے ساتھ اٹھائی ہے" غرض اگرچہ میر صاحب اکبر آباد میں پیدا ہوئے اور اُن کے ... کا زمانہ بھی وہیں گزرا، لیکن بعد میں وہ دلّی میں ... ئے اور دلّی ہی کو اپنا وطن بنالیا حقیقت یہ ہے کہ ... و دلی سے نہیں بلکہ دلّی کو اُن کے توطن سے فخر ہے ... وہ دلّی ہی کے ہوگئے اور دلّی ہی کے کہلائے اور انکی ... سمجھی، جو اُس زمانہ میں مایۂ افتخار اور شرافت کی ایک ... ت سمجھی جاتی تھی، دلّی ہی کی تھی، گو انھوں نے خان ... کی ... سے فیض پایا، مگر اُن کے اور خان مذکور

کے ذوق میں زمین و آسمان کا فرق ہے میر صاحب فطرتی طور پر شاعر واقع ہوے تھے اور ذوق شعر اُن کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا وہ کسی کی صحبت یا شاگردی سے مستغنی معلوم ہوتے ہیں۔

دلی کا مطلع اُس وقت دھندلا ہورہا تھا ادبار و انحطاط کا سامان ہوچکا تھا الوالعزم تیمور اور بابر کی بےحس اولاد انکے مشہور آفاق تخت پر بے جان تصویر کی طرح متمکن تھی اقبال جواب دیچکا تھا اور سیاہ رو زوال اُن کے گردوپیش منڈلا رہا تھا جہاں بادشاہ خود دست نگر اور امیر امرا مضمحل و پریشان ہوں وہاں کمال کی قدر کون کرسکتا ہے۔ باوجود اس کے اُس عہد کے تمام باکمال اور نامور شاعر جن کا نام اردو زبان کے ساتھ ہمیشہ زندہ رہیگا اسی شہر دلی کے تھے "اگر تاریخ پر نظر ڈالی جاے تو یہ شہر بھی عجیب و غریب نظر آتا ہے زمانہ قدیم سے محسود آفاق اور مرجع خلایق رہا، کبھی راجاؤں اور مہاراجاؤں کی راج دھانی، کبھی سلاطین اسلام کا دارالخلافہ کبھی طغیانی کی بدولت بہ کر خراب اور رفتہ رفتہ پھر آباد ہوا، کبھی معرکہ جنگ و جدل و قتل عام ہے اور کبھی گھر گھر دن عید اور رات شب برات ہے! کبھی مدنظر شاہان و مرجع کمال ہے اور کبھی ایک مطلق العنان سودائی کی لہک سے خاصا کھنڈر ہے! کبھی مورد بلیات و آفات ہے اور کبھی منزل برکات و حسنات! غرض یہ نگری یونہی اجڑتی

اور بستی، بگڑتی اور بنتی رہی۔ مگر بایں ہمہ اس کے حسن عالم افروز میں نئی ادا پیدا ہوتی رہی اور ہر حادثے کے بعد فوراً سنبھل گئی۔ لیکن آخر زمانے میں جب سلطنت مغلیہ میں انحطاط اور زوال کی علامات پیدا ہوگئیں تو وہ ایک دھکّے ایسے لگے کہ پھر پنپنا محال ہوگیا سب سے اول نادر شاہی طوفان کا تھپیڑا ایسا لگا کہ اس نے بٹھا ہی تو دیا۔ اس کے سترہ برس بعد ہی احمد شاہ درانی کی چڑھائی ہوئی۔ پھر مرہٹوں نے وہ اودھم مچایا کہ رہا سہا سب خاک میں ملادیا۔ اب تک جو باکمال دلّی میں پڑے وضعداری نباہ رہے تھے ان حادثوں کے بعد وہ بھی نہ ٹک سکے۔ سوائے ایک میر درد کے جنتی نسبت صاحب تذکرہ گلشن ہند کہتے ہیں کہ "جن ایام میں معمورہ شاہجہان آباد کا اور ہر ایک کوچہ اس خجستہ بنیاد کا مجمع اہل کمال سے اور کثرت منتخبان عدیم المثال سے رشک ہفت اقلیم اور غیرت جنت النعیم تھا تو معمورے شہر کے عرصہ ربع مسکون کا تنگ اور اس خراب آباد کو قبّہ سے ہفت اقلیم کے ننگ تھا۔ جبکہ متواتر نزول آفات کے باعث اور مکرر ورود بلیّات کے سبب خراب ہوا اور مصدر عقوبت و عذاب ہوا، تو ہر ایک درویش گوشہ نشیں نے اور ہر ایک صابر زاویہ گزیں نے اور ہر ایک تونگر مالدار نے اور ہر ایک امیر عالی مقدار نے فرار کو غنیمت جانا اور بھاگے ادھر کو جدھر پایا ٹھکانا۔ مگر وہ سیدِ والا تبار

کہ نام نامی اس کا خواجہ میر تھا، اُس قطب آسمان استقلال نے خیال بھی جگہ سے سرکنے کا نہ کیا، متحمل بلاؤں کے اور حامل جفاؤں کے ہوئے، اور شاہ جہاں آباد کو چھوڑ کر ایک قدم راہ اپنے کنج عزلت سے نہ گئے"

ایسے وقت میں شاعر بیچارے تو کس گنتی میں ہیں بڑے بڑے وضعداروں اور متوکلوں کی اوسان بجا نہیں رہتے دلّی کے اجڑنے کے بعد لکھنؤ آباد نظر آتا تھا۔ آصف الدولہ سا لکھ لٹ نواب تھا، اہل کمال کی قدر ہونے لگی پھر جو اٹھا وہیں پہنچا اور پہنچ کر وہیں کا ہو رہا۔ غالباً سب سے پہلے نادر شاہ کی تباہی کے بعد سراج الدین علی خاں آرزو پہنچے اُس کے بعد سودا تشریف لے گئے۔ سودا کے انتقال کے بعد میر تقی نے ۱۱۹۷ھ (۱۷۸۲ء) میں دلّی سے لکھنؤ کو کوچ فرمایا۔ میر صاحب کے جاتے ہی دلّی سونی ہوگئی اور میر حسن، میر سوز جرات سب لکھنؤ میں جا بیٹھے اور دلی کی رونق لکھنؤ میں آگئی

لکھنؤ آنے سے پہلے میر صاحب کی شہرت یہاں پہنچ چکی تھی یہاں آئے تو لوگوں نے اُن کے لئے آنکھیں بچھا دیں۔ امیر سے لے کر غریب تک اور بادشاہ سے لیکر فقیر تک نے اعزاز و قدردانی میں سبقت کی۔ گویا میر صاحب کے آنے سے لکھنؤ کو بھاگ لگ گئے، شعر و سخن میں جان پڑ گئی اور مشاعروں کی رونق بڑھ گئی۔ میر صاحب مرجع کمال بن گئے اور

---

[1] مقدمہ گلشن ہند از راقم

دور سے لوگ اس شوق میں آتے تھے کہ میر صاحب کی زبان مبارک سے ان کا کلام سنیں اور اپنے اپنے شہروں کو اُن کے اشعار بطور سوغات کے لیجائیں یہ قبولیت اردو کے کسی دوسرے شاعر کو نصیب نہیں ہوی تھی اُس وقت سے اب تک میر صاحب کے کمال کا سکّہ لوگوں کے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے اور بڑے بڑے شاعروں نے انھیں استاد مانا ہی چنانچہ مرزا غالب فرماتے ہیں ریختے کے تمھیں استاد نہیں ہو غالب کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوی میر بھی تھا

ایک دوسری جگہ فرمایا ہے۔

غالب اپنا یہ عقیدہ ہی بقول ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

ذوق کا ایک شعر ہے

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب
ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

مگر میر صاحب اپنے کمال سے خود واقف تھے اور انھیں اس پر ناز تھا۔ اور اس کا اظہار انھوں نے جابجا اس طور سے کیا ہے کہ دوسرے کی مجال نہیں۔ چنانچہ چند اشعار اس مضمون کے یہاں نقل کیے جاتے ہیں :-

ریختہ خوب ہی کہتا ہی جو انصاف کرو — چاہیے اہل سخن میر کو استاد کریں
کیا جانوں دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میر کے — کچھ طرز ایسی بھی نہیں ایہام بھی نہیں
جہاں سے دیکھیے یک شعر شور انگیز نکلے ہے — قیامت کا سا ہنگامہ ہی ہر جا میر دیوانیں

کہ جو بات وہ کہنی چاہتے ہیں وہ دل میں اترجاتی ہے غرض یہ کہ اُن کا کلام بہ لحاظ فصاحت و روانی سہل ممتنع ہے اور سہل ممتنع کلام کا تجزیہ کرکے الگ الگ اس کی خوبیوں کو گنوانا ناممکن ہے۔ کیونکہ اس سے کلام کی اصلی خوبی کا کامل اندازہ تو ہوتا نہیں البتہ اس کی نسبت غلط فہمی پیدا کردینے کا اندیشہ ضرور ہوتا ہے۔

میری رائے میں کسی شاعر کے کلام کا ایک بڑا معیار اُس کلام کی تاثیر ہے، اور اگر اس معیار پر میر صاحب کے کلام کو جانچا جائے تو اُن کا رتبہ اردو شعرا میں سب سے اعلیٰ پایا جاتا ہے اُن کے اشعار سوز و گداز اور درد کی تصویریں ہیں زبان سے نکلتے ہی دل میں جاکر بیٹھ جاتے ہیں میر صاحب کی عمر کوئی سو برس کی تھی اور اُن کو وفات پائے بھی سو برس سے زیادہ ہوتے ہیں۔ لیکن اب تک یہ حال ہے کہ لوگ اُن کے کلام کو پڑھ پڑھ کر مزے لیتے اور سر دھنتے ہیں۔

میری یہ رائے میر صاحب کے منتخب کلام کی نسبت ہے ورنہ اُن کی ضخیم کلیات میں رطب و یابس سب کچھ بھرا پڑا ہے مولانا آزردہ نے اُن کے کلام کی نسبت اپنے تذکرے میں صحیح لکھا ہے کہ "پستش بغایت پست و بلندش بغایت بلند است" اس پر مولانا حالی کی عام رائے کا نقل کردینا جو انھوں نے شعرا کی

نسبت لکھی ہے، لطف سے خالی نہ ہوگا۔

"یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ دنیا میں جتنے شاعر اُستاد مانے گئے ہیں یا جن کو استاد ماننا چاہیئے، اُن میں ایک بھی ایسا نہ نکلیگا جس کا تمام کلام اول سے آخر تک حسن و لطافت کے اعلےٰ درجے پر واقع ہوا ہو کیونکہ یہ خاصیت صرف خدا ہی کے کلام میں ہوسکتی ہے...
شاعر کی معراج کمال یہ ہے کہ ان کا عام کلام ہموار اور اصول کے موافق ہو اور کہیں کہیں اس میں ایسا حیرت انگیز جلوہ نظر آئے جس سے شاعر کا کمال خاص و عام کے دلوں پر نقش ہوجائے البتہ اتنی بات ہے کہ اُس کے عام اشعار بھی خاص خاص اشخاص کے دل پر خاص خاص حالتوں میں تقریباً ویسا ہی اثر کریں جیسا کہ اُسکا خاص کلام ہر شخص کے دل پر ہر حالت میں اثر کرتا ہے اور یہ بات اُسی شاعر کے کلام میں پائی جاسکتی ہے جس کا کلام سادہ اور نیچرل ہو۔"

میر صاحب کے کلام میں ایسے حیرت انگیز جلوے اکثر نظر آتے ہیں جس طرح بعض اوقات سمندر کی سطح دیکھنے میں معمولی اور بے شور و شر نظر آتی ہے لیکن اُس کے نیچے ہزاروں لہریں موج زن ہوتی اور ایک کھلبلی مچائے رکھتی ہیں اسی طرح اگرچہ میر صاحب کے اشعار کے الفاظ ملائم، دھیمے، سلیس اور سادہ ہوتے

ہیں لیکن ان کی تہ میں غضب کا جوش یا درد چھپا ہوتا ہے الفاظ کی سلاست اور ترکیب کی سادگی لوگوں کو اکثر دھوکا دیتی ہے وہ اُن پر سے بے خبر گزر جاتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ شاعر نے ان سلیس الفاظ اور معمولی ترکیب میں کیا کیا کمال بھر رکھے ہیں میر صاحب کا کلام اس بارے میں اپنا جواب نہیں رکھتا اور غور سے پڑھنے کے قابل ہے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ پڑھنے والے قدیم الفاظ یا محاورے یا متروک ترکیب کو دیکھکر شعر چھوڑ دیتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ اسی لفظ یا ترکیب نے جسے وہ متروک سمجھتے ہیں خاص لطف پیدا کردیا ہے یا کم سے کم وہ شعر کے حسن میں حارج نہیں۔

میں یہاں چند شعر مثال کے طور پر نقل کرتا ہوں جس سے اُن کے کلام کے حسن و خوبی اور اُن کے خاص انداز کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

ہمارے آگے ترا جب کسی نے نام لیا — دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا
مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں — تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

ہم خاک میں ملے تو ملے لیکن اے سپہر — اس شوخ کو بھی راہ پہ لانا ضرور تھا

یاد اسکی اتنی خوب نہیں میر باز آ — ناداں پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائیگا

جو اس شور سے میر روتا رہے گا — تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا — دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا
عہد جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند — یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

یاں کے سفید و سیہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا اور دن کو جوں توں شام کیا

گل کی جفا بھی دیکھی دیکھی وفائے بلبل
اک مشت پر پڑے تھے گلشن میں جائے بلبل

کیونکر گلی سے اسکی اٹھ کر میں چلا جاتا
یاں خاک میں ملنا تھا لوہو میں نہانا تھا

کہتا تھا کسو سے کچھ تکتا تھا کسو کا منہ
کل میر کھڑا تھا یاں سچ ہے کہ دیوانا تھا

جفائیں دیکھ لیاں بیوفائیاں دیکھیں
بھلا ہوا کہ تری سب برائیاں دیکھیں

ہوگا کسی دیوار کے سائے کے تلے میر
کیا کام محبت سے اس آرام طلب کا

ایک شخص مجھی سا تھا کہ تھا تجھسے پہ عاشق
وہ اسکی وفا پیشگی وہ اسکی جوانی

یہ کہکے میں رویا تو لگا کہنے نہ کہہ میر
سنتا نہیں میں ظلم رسیدوں کی کہانی

جب کوندتی ہے بجلی تب جانب گلستاں
رکھتی ہے چھیڑ میرے خاشاک آشیاں سے

خاموشی ہی میں ہم نے دیکھی ہے مصلحت اب
ہر اک سے حال دل کا مدت کہا زباں سے

جب نام ترا لیجے تب چشم بھر آوے
اس طرح کے جینے کو کہاں سے جگر آوے

متصل روتے ہی رہنے تو بجھے آتش دل
ایک دو آنسو تو اور آگ لگا جاتے ہیں

شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے۔
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

عشق ہمارے خیال پڑا ہے خواب گیا آرام گیا
دل کا جانا ٹھیر گیا ہے صبح گیا یا شام گیا

جی ہی دینے کا نہیں کڑھنا فقط
اس کے در سے جانے کی حسرت بھی ہے

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

اس آخری شعر میں مولانا حالی نے اپنے مقدمہ دیوان میں ایک بہت ہی پرلطف لطیفہ لکھا ہے جس سے نہ صرف اس شعر کی خوبی بلکہ میر صاحب کے کلام کی خصوصیت کا پورا اندازہ ہوتا ہے مولانا فرماتے ہیں کہ

"مولانا آزردہ کے مکان پر اُن کے چند احباب جن میں مومن اور شیفتہ بھی تھے ایک روز جمع تھے میر کا یہہ شعر پڑھا گیا شعر کی بے انتہا تعریف ہوی اور سب کو یہ خیال ہوا کہ اس قافیے کو ہر شخص اپنے اپنے سلیقے اور فکر کے موافق باندھ کر دکھائے سب قلم دوات اور کاغذ لیکر الگ الگ بیٹھ گئے اور فکر کرنے لگے اسی وقت ایک اور دوست وارد ہوے مولانا سے پوچھا کہ حضرت کس فکر میں بیٹھے ہیں؟ مولانا نے کہا قل ہو اللہ کا جواب لکھ رہا ہوں"

مولانا حالی نے اسی شعر کے متعلق یہ راے ظاہر کی ہے

"ظاہر ہے کہ جوش جنوں میں گریباں یا دامن یا دونوں کو چاک کرنا ایک نہایت متبذل اور پامال مضمون ہے جسکو قدیم زمانے سے لوگ برابر باندھتے چلے آئے ہیں، ایسے چیتھڑے ہوے مضمون کو میر نے باوجود غایت درجے کی سادگی کے ایک ایسے اچھوتے، نرالے اور دلکش اسلوب میں ادا کیا ہے کہ اس سے بہتر اسلوب تصور میں نہیں آسکتا اس اسلوب میں بڑی خوبی یہی ہے کہ سیدھا سادہ ہی نیچرل ہے اور باوجود اس کے بالکل انوکھا ہے"

یہی خوبی میر کے تمام منتخب کلام میں پائی جاتی ہے چنانچہ چند اشعار جو نمونے کے طور پر اوپر لکھے گئے ہیں، اُن کے پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ زبان کی سلاست و فصاحت

کے ساتھ پیرایۂ بیان کس قدر دلکش نرالا اور پُرتاثیر ہے
یوں میر صاحب کے تمام ناصر ہمعصروں کے کلام میں
سادگی، صفائی، اور روزمرہ کی پابندی پائی جاتی ہے لیکن
محض سلاست اور زبان کی فصاحت کام نہیں آسکتی
جب تک کہ بیان میں تازگی، ادائے مطلب میں شگفتگی
اور خیال میں بلندی و جدت نہ ہو۔ میر صاحب کے
کلام میں یہ سب خوبیاں ایک جا جمع ہیں اور پھر اس
پر درد اور تاثیر خدا داد معلوم ہوتے ہیں اسی وجہ
سے وہ اپنے تمام ہمعصروں میں ممتاز اور اردو شاعروں
میں خاص درجہ رکھتے ہیں اور ان کی اس ممتاز خصوصیت
کو اب تک کوئی نہیں پہنچا ہے البتہ خواجہ میر درد ایک
ایسے شاعر ہیں جنھوں نے سلاست و فصاحت زبان
کے ساتھ اخلاقی مضامین اور صوفیانہ خیالات کی چاشنی دی
ہے اور کلام میں درد پیدا کیا ہے بیان میں جدت
اور تازگی بھی پائی جاتی ہے جس سے وہ میر صاحب
کے لگ بھگ پہنچ جاتے ہیں لیکن بیان میں وہ گھلاوٹ
نہیں جو میر صاحب کے ہاں ہے اور نہ غایت درجہ
سلاست و سادگی کے ساتھ وہ سوز و گداز ہے اور
نہ تخیل کی وہ شان ہے جو شاعری کی جان ہے خصوصاً
بیان کا وہ انوکھا انداز جس میں ایک خاص نزاکت
ہوتی ہے نظر نہیں آتا میر صاحب کا بڑا کمال اسی میں

ہے ۔ میر انیس بھی جن کا فصاحت میں بہت بلند درجہ
ہے ۔ اور جو سوز و غم کے بیان میں اپنی نظیر نہیں رکھتے
میر صاحب کو نہیں پہونچتے میر انیس میں پھر بھی تصنع
اور تکلف آجاتا ہے میر اس سے بالکل بری ہے وہ
خود سوز وغم کا پتلا ہے اور اس کا شعر سوز وغم کی
صحیح اور سچی تصویر ہے جس میں تکلف کا نام نہیں ۔ میر
انیس کے ہاں خیال کے مقابلے میں الفاظ کی بہتات
ہے اور خیال سے پہلے لفظ پر نظر پڑتی ہے لیکن میر
کے اشعار میں الفاظ خیال کے ساتھ اس قدر چسپاں ہیں
کہ پڑھنے والا محو ہوجاتا ہے اور اسے لفظ خیال سے
الگ نظر نہیں آتا ۔ میر انیس کے ہاں دھوم دھام اور
بلند آہنگی ہے میر کے ہاں سکون اور خاموشی ہے اور
اس کے شعر چپکے چپکے خود بخود دل میں اثر کرتے چلے جاتے
ہیں جس کی مثال اُس نشتر کی سی ہے جس کی دھار
نہایت باریک اور تیز ہے اور اُس کا اثر اسی وقت معلوم
ہوتا ہے جب وہ دل پر جاکر کھٹکتا ہے ۔ میر انیس رلاتے
ہیں ، میر خود روتا ہے ۔ یہ آپ بیتی ہے اور وہ جگبیتی
میر کے کلام کی جن خصوصیتوں کا ذکر ہوا ہے ۔
وہ مثال سے پوری طرح واضح ہوجائینگی جو اشعار نمونے
کے طور پر اوپر لکھے گئے ہیں اُن میں کا ایک شعر یہ ہی
ہوگا کسی دیوار کے سائے کے تلے میر کیا کام محبت سے اُس آرام طلب کو

اس شعر کا حسن شرح و بیان سے باہر ہے آرام طلب کا لفظ اس کی جان ہے اس لفظ کو نظر میں رکھئے اور پھر اس شعر کو غور سے ملاحظہ کیجئے تو شعر کا اصلی لطف سمجھ میں آئے گا ایک شخص جو محبت کے کارن عیش و آرام پر لات مار کے اور گھربار چھوڑ کر بے یار و بے خانماں، آوارہ و سرگرداں، محبوب کی دیوار کے نیچے پڑا ہے، اُسے طعنہ دیا جاتا ہے کہ آرام طلب ہے اور ایسے آرام طلب کو محبت سے کیا کام! جب یہ آرام طلبی ہے تو قیاس کرنا چاہیئے کہ محبت کی مصیبت کیا ہوگی اور شاعر عاشق سے کیا توقع رکھتا ہے ؟ ایک دوسری مثال لیجئے۔

ایک شخص مجھی سا تھا کہ تھا تجھ سے پہ عاشق وہ اس کی وفا پیشگی وہ اس کی جوانی
یہ کہہ کے میں رویا تو لگا کہنے نہ کہہ میر سنتا نہیں میں ظلم رسیدوں کی کہانی

اس میں کوئی اعلٰے درجے کا مضمون یا کوئی مبالغہ یا استعارہ و تشبیہ یا کسی قسم کی صنعت نہیں مگر اظہار مطلب کے لئے کیا خوبصورت پیرایہ اختیار کیا گیا ہے اس قسم کے اظہار حال میں سخت مشکل پیش آتی ہے۔ اور انسان ہزار کوشش کرے اور کیسا ہی پہلو کیوں نہ اختیار کرے چھوٹا پنے سے بچ نہیں سکتا شاعر نے اس بدتمیزی سے بچنے کے لئے پردے ہی پردے میں نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ درد دل کی کیفیت کا اظہار

کیا ہے اور اس پیرائے سے جو اثر پیدا ہوسکتا ہے وہ
کبھی صاف صاف اپنے حال کے بیان کرنے سے نہیں ہوسکتا
اور پھر لطف یہ ہے کہ اس میں کہیں معشوق کی جفا
یا بے وفائی کا ذکر نہیں صرف عاشق کی جوانی اور اس
کے حال زار کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور یہ کہہ کے
اس کا رونے لگنا اس کے درد دل کو آشکارا کردیتا ہے
اور یہاں پردہ خود بخود اٹھ جاتا ہے یہ پیرایہ غضب
کا درد انگیز ہے اور پھر معشوق کے جواب نے اس درد
میں ہزاروں ٹیسیں پیدا کردی ہیں یہ میر صاحب کا
خاص کمال ہے اور یہی چیز ہے جو ان کی شاعری کو
ہمیشہ زندہ رکھے گی۔

جو اس شور سے میر روتا رہے گا تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

اس میں کوئی خاص مضمون یا بات نہیں مگر شعر کسقدر
پر درد ہے دوسرے مصرعے نے اسے نہایت درد انگیز
بنا دیا ہے یہ سلاست اور یہ انداز بیان اور اس میں
یہ درد میر صاحب کا حصہ ہے ان اشعار کے سامنے
صنائع و بدائع، تکلف و مضمون آفرینی، فارسی و عربی
ترکیبیں کچھ حقیقت نہیں رکھتیں

مقدور بھر تو ضبط کروں ہوں پہ کیا کروں منہ سے نکل ہی جاتی ہو اک بات پیار کی

یہ شعر میر کے اعلیٰ یا منتخب اشعار میں سے نہیں
ایک معمولی شعر ہے، لیکن دل کی ایک فطری کیفیت

کس خوبی سے بیان کیا ہے اور جیسا یہ خیال فطرتی اور سادہ ہے ویسے ہی الفاظ بھی سادہ اور بندش اور ترکیب بھی صاف اور ستھری ہے مگر انداز بیان کا حسن یہاں بھی وہی ہے

ایسے اشعار میر کے کلام میں سینکڑوں ملیں گے، اسلئے یہاں اور اشعار کا مثال کے طور پر لکھنا اس مضمون کو طول دینا ہوگا۔

میر صاحب کے کلام میں اخلاقی و حکیمانہ اشعار کی بھی کچھ کمی نہیں، لیکن اخلاق ہو یا حکمت، اندرونی کیفیت ہو یا بیرونی حالت، انداز بیان وہی ہے۔ نہایت معمولی اور سادہ الفاظ میں بڑے بڑے نکات اور بلند مضامین اس بے تکلفی سے بیان کر جاتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ بلکہ بعض اوقات سرسری طور پر پڑھنے سے خیال نہیں گزرتا کہ ان سادہ الفاظ اور سلیس ترکیبوں کے پردے میں ایسے ایسے بلند خیالات پنہاں ہیں!

مثال کے طور پر یہاں چند شعر لکھے جاتے ہیں۔

سرسری تم جہان سے گزرے　　ورنہ ہر جا جہان دیگر تھا

(کس قدر بلند اور اعلی مضمون ہے مگر کس خوبی اور آسانی سے ادا کیا گیا ہے)

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آگیا　　یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا

کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر　　میں بھی کبھو کسو کا سر پر غرور تھا

تھی جو دو منزل میں راہ عشق کی　　دل غریب ان میں خدا جانے کہاں مارا گیا

ہم نہ کہتے تھے کہ مت دیر و حرم کی راہ چل ؟ اب یہ دعویٰ حشر تک شیخ و برہمن میں رہا
یہ بھی طرفہ ماجرا ہے کہ اسی کو چاہتا ہوں مجھے چاہئے ہے جس سے بہت احتراز کرنا

اوپر کے ان تینوں شعروں میں انسان کی حالت کا کس قدر سچا نقشہ کھینچا ہے ۔

بارے دنیا میں رہو غم زدہ یا شاد رہو ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو
کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات کلی نے یہ سنکر تبسم کیا
ہر دم قدم کو اپنے رکھ احتیاط سے یاں یہ کارگاہ ساری دوکان شیشہ گر ہے
اڑنے کی یک ہوس ہے ہم کو قفس سے ورنہ شائستہ پریدن بازو میں پر کہاں ہے

ملک کی موجودہ سیاسی حالت پر یہ شعر کسقدر صادق آتا ہے

اب پست و بلند ایک ہے جوں نقش قدم یاں پامال ہوا خوب تو ہموار ہوا میں

میر صاحب کا کلام عاشقانہ ہے لیکن ان میں اکثر اشعار ایسے ملیں گے جن میں کوئی اخلاقی یا حکیمانہ نکتہ نہایت خوش اسلوبی سے بیان کیا گیا ہے ۔ انسان کی طبیعت کے دو رنگ ہیں لطف و مسرت یا اندوہ و الم میر صاحب کے اشعار عاشقانہ ہوں یا حکیمانہ ان میں اندوہ و الم، ناکامی و مایوسی کی جھلک پائی جاتی ہے یہ انکی طبیعت کی افتاد ہے وہ کسی حال میں ہوں کوئی کیفیت اُن پر طاری ہو اُن کے دل سے جب کوئی بات نکلی وہ یاس و ناکامی میں ڈوبی ہوئی تھی ۔ ظرافت کی چاشنی میر صاحب کے کلام میں مطلق نہیں مگر نہ معلوم کیا اتفاق ہوتا تھا وہ کیسی سبھ گھڑی ہوتی تھی کہ جب اُن کے افسردہ

اور حرماں نصیب دل کی کلی کھلتی اور وہ ایک آدھ شعر اس قسم کا بھی کہہ جاتے۔ اُن کے کلام میں چند ظرافت اشعار بھی پائے جاتے ہیں لیکن یا تو وہ ایسے متبذل قسم کے ہیں کہ اُن سے بد مذاقی پائی جاتی ہے یا وہی حسرت و یاس جو اُن کے دم کے ساتھ تھی حیرت ہی کہ ظرافت کے وقت بھی یہ رنگ نہ گیا چنانچہ فرماتے ہیں

تھا میر بھی دیوانہ پر ساتھ ظرافت کے ہم سلسلہ داروں کی زنجیر ہلا جاتا

میر صاحب نے چند قصیدے بھی لکھے ہیں لیکن بے مزہ اور پھیکے ہیں وہ اس گوں کے نہیں تھے اور قصیدہ لکھنا ان کی طبیعت کی افتاد کے خلاف تھا جسکی وجہ ہم آگے چلکر بیان کریں گے۔

البتہ مثنویاں قابل ذکر ہیں یوں تو چودہ پندرہ مثنویاں ہیں لیکن بعض ان میں ایسی ہیں کہ اب بھی انکا پڑھنا لطف سے خالی نہیں مثلاً دو مثنویاں جو اپنے گھر کی خرابی اور برسات کی شکایت میں لکھی ہیں، خوب ہیں۔ برسات میں اس مصیبت کا حال بہت ہی درد ناک ہے صحیح اور سچی واردات جو ایسی حالت میں واقع ہوتی ہے اس طرح لکھی ہے کہ آنکھوں کے سامنے بے سروسامانی کا نقشہ کھچ جاتا ہے اور غربا پر جو اس موسم میں گزرتی ہے اُس کی حقیقی تصویر اس سے بہتر کہیں نہیں ملتی مثنوی جوش عشق اور خواب و خیال بھی پڑھنے کے قابل ہیں، اسی طرح جھوٹ کی مذمت

مناجات عاشقاں، عشق خانماں آباد کی مثنویاں بھی اپنی
اپنی جگہ پر بہت پُرلطف ہیں۔ مثنویوں میں بھی میر صاحب
کا انداز بیان بہت سادہ اور دلگداز ہے اس سے پہلے
اردو میں مثنوی کا یہ انداز کہیں نہیں پایا جاتا مثنوی اصناف
نظم میں بہت مشکل ہے میر صاحب نے اسے خوب نبھایا
ہے اردو زبان میں میر صاحب کی مثنویاں سب سے پہلا
اور عمدہ نمونہ ہیں مثنوی کو انھیں کی بدولت ترقی ہوی
اور میر حسن اور شوق وغیرہ سب انھیں کے مقلد ہیں
میر کی مثنویوں کے متعلق مولانا حالی کی رائے بہت سچی
اور جچی تلی ہے۔

"اب تک اردو میں جتنی عشقیہ مثنویاں ہماری نظر
سے گزری ہیں ان میں سے صرف تین شخصوں کی مثنوی
ایسی ہے جس میں شاعری کے فرائض کم و بیش ادا ہوے
ہیں اول میر تقی جنھوں نے غالباً سب سے اول چند
عشقیہ قصے اردو مثنوی میں بیان کئے ہیں جس زمانے
میں میر نے یہ مثنویاں لکھی ہیں اُس وقت اردو زبان میں
فارسیت بہت غالب تھی اور مثنوی کا کوئی نمونہ اردو
زبان میں غالباً موجود نہ تھا اور اگر ایک آدھ نمونہ موجود
بھی ہو تو اس سے چنداں مدد نہیں مل سکتی اس کے
سوا اگرچہ غزل کی زبان بہت منجھ گئی تھی مگر مثنوی کا
رستہ صاف ہونے تک ابھی بہت زمانہ درکار تھا اسی لئے

میر کی مثنویوں میں فارسی ترکیبیں فارسی محاوروں کے ترجمے
اور ایسے فارسی الفاظ جنکی اب اردو زبان متحمل نہیں ہوسکتی
اُس انداز سے جو آج کل فصیح اردو کا معیار ہے بلاشبہ
کسی قدر زیادہ پائے جاتے ہیں۔ نیز اردو زبان کے بہت
سے الفاظ و محاورات جو اب متروک ہوگئے ہیں میر کی
مثنوی میں موجود ہیں اگرچہ یہ تمام باتیں میر کی غزل میں
بھی کم و بیش پائی جاتی ہیں، مگر غزل میں ان کی کھپت
ہوسکتی ہے کیونکہ غزل میں اگر ایک شعر بھی صاف اور
عمدہ نکل آئے تو ساری غزل کو شان لگ جاتی ہے وہ
عمدہ شعر لوگوں کی زبان پر چڑھ جاتا ہے اور باقی پُرکن
اشعار سے کچھ سروکار نہیں رہتا لیکن مثنوی میں جستہ جستہ
اشعار کے صاف اور عمدہ ہونے سے کام نہیں چلتا۔ زنجیر
کی ایک کڑی بھی ناہموار اور بے میل ہوتی ہے تو ساری
زنجیر آنکھوں میں کھٹکتی ہے پس ان اسباب سے شاید میر
کی مثنوی آج کل کے لوگوں کی نگاہ میں نہ جچے مگر اس
سے میر کی شاعری میں کچھ فرق نہیں آتا، جس وقت میر
نے یہ مثنویاں لکھی ہیں اس وقت اس سے بہتر زبان
میں مثنوی لکھنی امکان سے خارج تھی باایںہمہ میر کی مثنوی
اکثر اعتبارات سے امتیاز رکھتی ہے۔ باوجودیکہ میر صاحب
کی عمر غزل گوی میں گزری ہے، مثنوی میں بھی بیان کے
انتظام اور تسلسل کو انھوں نے کہیں ہاتھ سے جانے نہیں

دیا اور مطالب کو بہت خوبی سے ادا کیا ہے جیسا کہ ایک مشاق اور ماہر استاد کرسکتا ہے اس کے سوا صاف اور عمدہ شعر بھی میر کی مثنوی میں بہ مقابلہ اُن اشعار کے جن میں پرانے محاورے یا فارسیت غالب ہے کچھ کم نہیں ہیں صدہا اشعار میر کی مثنویوں کے آج تک لوگوں کے زبان زد چلے آتے ہیں۔

اگرچہ میر کی مثنویوں میں قصہ پن بہت کم پایا جاتا ہے انھوں نے چند صحیح یا صحیح نما واقعات بطور حکایات کے سیدھے سادے طور پر بیان کئے ہیں نہ ان میں کسی شادی یا تقریب یا وقت اور موسم کا بیان کیا گیا ہے، نہ کسی باغ یا جنگل یا پہاڑ کی فضا یا اور کوئی ٹھاٹھ دکھایا گیا ہے مگر جتنی میر کی عشقیہ مثنویاں ہم نے دیکھی ہیں وہ سب نتیجہ خیز اور عام مثنویوں کے برخلاف بے شرمی اور بے حیائی کی باتوں سے مبرا ہیں"

اس میں شک نہیں کہ میر کے کلام میں فارسیت کا رنگ زیادہ ہے مگر اس پر بھی صاف اور ستھرے اشعار بھی کثرت سے پائے جاتے ہیں فصاحت اور سلاست متاخرین کے کلام سے کہیں زیادہ ہے اگرچہ میر اور انکے ہمعصر شعرا کے کلام میں فارسیت غالب ہے لیکن اس زمانہ میں عربیت کا رنگ جو غالب ہوتا جاتا ہے وہ اُس سے کچھ کم نہیں ہے ان بزرگوں نے تو پھر بھی یہ کیا کہ

جہاں کثرت سے فارسی الفاظ اور محاورے اور فارسی ترکیبیں داخل کیں وہاں بہت سے الفاظ کو اپنا بنالیا اور اردو صرف و نحو کے خراط پر چڑھاکر اردو بنالیا لیکن آج کل یہ کوشش کی جاتی ہے کہ عربی الفاظ اور ترکیبوں کو جوں کا توں رکھا جائے تاکہ ایسا نہ ہو کہ یہ مقدس الفاظ اردو صرف و نحو کے چھو جانے سے نجس نہ ہو جائیں اُن بزرگوں نے زبان کو بنانے اور وسیع کرنے کی کوشش کی اور بہت بڑا احسان کیا مگر آج کل لوگ اُن کی تقلید کو ننگ سمجھتے ہیں اور ان کی کوششوں کو غلط الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں حالانکہ وہ صحیح اصول پر چل رہے تھے اور ہم باوجود ہمہ دانی کے زبان کی اصلی ترقی و نشو و نما کے گر سے ناواقف ہیں ایک دوسرا فریق جو فارسی عربی کے مقبول الفاظ نکال کر اُن کی جگہ غیر مانوس اور ثقیل سنسکرت کے الفاظ ٹھونسنا چاہتا ہے اُسی نافہمی میں مبتلا ہے۔ ہماری رائے میں یہ دونوں زبان کے دشمن ہیں۔ اس رجحان کے خاص اسباب ہیں جن پر ہم اس وقت بحث کرنی نہیں چاہتے اور اُسے کسی دوسرے وقت کے لئے اٹھا رکھتے ہیں لیکن اس قدر ضرور جتا دینا چاہتے ہیں کہ اگر ہمیں اپنی زبان سے محبت ہے اور درحقیقت ہم اُن کی ترقی کے خواہاں ہیں تو ہمیں پھر اُسی اصول کو اختیار کرنا چاہیئے۔

خود میر صاحب نے فارسی الفاظ و تراکیب کے استعمال کے متعلق اپنے تذکرہ شعرائے اردو یعنے نکات الشعرا[1] میں جو رائے ظاہر کی ہے وہ بہت ہی مناسب اور خوب ہے اور اب بھی قابل عمل ہے وہ لکھتے ہیں۔

"سیوم آنکہ حرف و فعل پارسی بکار برند وایں قبیح است چہارم آنکہ ترکیبات فارسی می آرند اکثر ترکیب کہ مناسب زباں ریختہ می افتد آں جائز است و ایں را غیر شاعر نمی داند و ترکیبے کہ نامانوس ریختہ می باشد آں معیوب است و دانستن ایں نیز موقوف سلیقہ شاعری است و مختار فقیر ہمیں است اگر ترکیب فارسی موافق گفتگوے ریختہ بود مضائقہ ندارد"

بہرحال میر کی مثنویوں کے بیسیوں شعر جو اب تک زبانوں پر چڑھے ہوے ہیں اس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے زمانے میں بہت مقبول تھیں اور اب بھی تاریخی لحاظ سے نیز اپنی بعض خوبیوں کی وجہ سے پڑھنے کے قابل ہیں یہاں بطور نمونہ ایسے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں جو اس وقت بھی زباں زد خاص و عام ہیں۔

ضبط کروں میں کب تک آہ اب چل اے خامے بسم اللہ اب
نے کہے نے دیر کے قابل مذہب ان کا ہے سیر کے قابل

---

[1] میر صاحب کا تذکرہ نکات الشعرا ہندی بہت نایاب ہے اتفاق سے دستیاب ہوگیا ہے اور عنقریب انجمن ترقی اردو کی طرف سے شایع ہوگا۔

میر جی اس طرح سے آتے ہیں جیسے کنجر کہیں کو جاتے ہیں

سنو اے عزیزان ذی ہوش و عقل کہ اس کارواں گہ سے کرنا ہے نقل

پیمبر ہے شہ ہے کہ درویش ہے سبھوں کو یہی راہ درپیش ہے

نہ یک بوئے خوش ہی ہوا ہوگئی وہ رنگینئ باغ کیا ہوگئی

جس کسو سے یہ پیار رکھتا ہے عاقبت اس کو مار رکھتا ہے

کہتے ہیں ڈوبتے اچھلتے ہیں ڈوبے ایسے کوئی نکلتے ہیں

رفتہ رفتہ ہوا ہوں سودائی دور پہنچی ہے میری رسوائی

آہ جو ہمدمی سی کرتی ہے اب تو وہ بھی کمی سی کرتی ہے

ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ صبر رخصت ہوا یک آہ کے ساتھ

میر صاحب کی رباعیات بھی کچھ کم پر لطف نہیں اور بعض تو بہت اچھی ہیں ان کے علاوہ متفرق مخمس مستزاد اور فرد وغیرہ ہیں لیکن میر کا اصل رنگ غزل ہی میں پایا جاتا ہے اور اس میں ان کا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا وہ غزل کے بادشاہ ہیں اور ان کی جتنی تعریف کیجائے کم ہے اہل ذوق خود پڑھ کر اس کا اندازہ کرسکتے ہیں۔

شاعر نہیں جو دیکھا تو تو ہے کوئی ساحر
دو چار شعر پڑھ کر سب کو رجھا گیا ہے

بعض بعض جگہ میر صاحب نے فارسی اشعار کا اردو میں اس خوبی سے ترجمہ کردیا ہے کہ اصل سے بڑھ گیا ہے سعدی کا ایک شعر ہے۔

دوستاں منع کنندم کہ چرا دل بتو دادم باید اول بتو گفتن کہ چنیں خوب چرائی

میر صاحب فرماتے ہیں۔

پیار کرنے کا جو خوباں ہم پہ رکھتے ہیں گناہ
ان سے بھی تو پوچھیئے تم اتنے کیوں پیارے ہوئے

اس شعر میں پیارے کے لفظ نے جو حسن پیدا کر دیا ہے وہ اہل ذوق سے پوشیدہ نہیں۔

سعدی کا ایک اور شعر ہے۔

گفتہ بودم چو بیائی غم دل با تو بگویم
چہ بگویم کہ غم از دل برود چوں تو بیائی

میر صاحب نے اسی مضمون کو کس خوبی سے ادا کیا ہے

کہتے تھے کہ یوں کہتے یوں کہتے اگر آتا
سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

ایک فارسی شعر ہے

عنقا سرد برکیمیا مپرس از فقرا ہیچ
عالم ہمہ افسانہ ما دارد و ما ہیچ

میر نے اس مضمون کو کس خوبی سے اپنے خاص انداز میں بیان کیا ہے۔

مشہور ہیں عالم میں تو کیا ہیں بھی کہیں ہم
القصہ نہ درپے ہو ہمارے کہ نہیں ہم

کہتے ہیں کہ انسان کا طرز بیان اس کی سیرت کا پرتو ہوتا ہے یہ مقولہ شاعر کے کلام پر اور بھی زیادہ صادق آتا ہے لیکن غالباً کسی شاعر کے کلام پر اسکی طبیعت اور سیرت کا اس قدر اثر نہ پڑا ہوگا جتنا میر کے کلام میں نظر آتا ہے جو شخص میر کے حالات اور ان کے اخلاق و سیرت سے واقف نہ ہو وہ ان کے کلام کو پڑھ کر بغیر کسی تذکرے کی مدد کے خود بخود انکے انداز ان کی طبیعت کی افتاد اور مزاج کو تاڑ جائیگا۔

اُن کے اشعار پڑھکر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے ایک
ایک لفظ، طرز بیان، ترتیب و نبدش میں اُن کے قلبی
واردات و احساسات کا نقشہ کھنچا ہوا ہے وہ شعر
میں اپنا دل نکال کے رکھ دیتے ہیں اور اُن کی جدت
بیان میں صاف اُن کے تیور نظر آتے ہیں میر صاحب
کی سیرت اُن کے کلام سے کچھ کم قابل قدر نہیں۔ بلکہ
میری ذاتی رائے ہے کہ زیادہ قابل وقعت ہے کلام سے
تو صرف یہی ہے کہ اُسے پڑھ کر ایک خاص قسم کی
لذت حاصل ہوتی ہے یا اُس کے اثر سے متاثر ہوکر
لطف ملتا ہے لیکن سیرت کی خوبی دوسروں کی اصلاح
کرتی اور اُن کو بناتی ہے کلام کا لطف تو ممکن ہے کسی
کو نہ آئے لیکن سیرت کے اثر سے بہت کم ہیں کہ
متاثر نہ ہوں اس میں ایک زبردست اخلاقی قوت ہے
جو اصلاح کا بڑا ذریعہ ہے اور کلام و سیرت میں وہی
فرق ہے جو قول و فعل میں ہوتا ہے میر کی وضعداری
نے کمال کی لاج رکھ لی۔ انھوں نے شاعری کو ذریعۂ
عزت یا وسیلہ معاش نہیں بنایا، ان کا صبر و استقلال
ان کی قناعت و بے نیازی اور ان کی غیرت اور
وضعداری وہ خوبیاں ہیں جو انسان کو کمال انسانیت
پر پہونچاتی اور فرشتوں سے بڑھا دیتی ہیں رنج و الم
سہے مگر کبھی اُف تک نہ کی، فاقے سے رہے مگر

کیا مجال کہ بھول کر بھی زبان پر حرفِ شکایت آیا ہو۔ اور یہی نہیں بلکہ کسی دوسرے کی بھی یہ مجال نہ تھی کہ اُن سے سلوک کرنے کی جرأت کرسکے یا ایسا خیال بھی دل میں لاسکے، محتاج رہے مگر ممکن نہ تھا کہ کسی کے سامنے دستِ سوال پھیلائیں ان کے مذہب میں یہ کفر تھا۔ وہ اپنے کمال میں مگن تھے اور خود اپنے تئیں اقلیم سخن کا شہنشاہ سمجھتے تھے وہ دنیا کے مال و دولت کو کبھی خاطر میں نہ لائے شاہوں کی شان و شوکت اور امیروں کی جاہ و ثروت اُن کے سامنے ہیچ تھیں۔ کسی کے سامنے سر جھکانا یا کسی سے اظہار مدعا کرنا اُن کے ہاں سب سے بڑی معصیت تھی۔

سر کسو سے فرو نہیں ہوتا
حیف بندے ہوے خدا نہ ہوے

ان سے یہ توقع رکھنی کہ وہ کسی کی مدح میں قصیدہ لکھیں بالکل عبث ہے اُن کی غیرت یہ کب گوارا کرسکتی تھی کہ کسی نااہل کی بھٹئی کریں یہ اُن کی فطرت کے خلاف تھا یہی وجہ ہے کہ دو تین قصیدے جو انھوں نے عمر بھر میں لکھے وہ بے مزہ، پھیکے اور بے لطف ہیں کہ خود فرماتے ہیں۔

مجھ کو دماغ وصفِ گل و یاسمن نہیں
میں جوں نسیم باد فروش چمن نہیں

اس میں شک نہیں کہ میر کے کمال کی قدر خود انہیں کی زمانے میں ایسی ہوی کہ کم کسی کو نصیب ہوی ہوگی لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ قدر زیادہ تر اُن کے زبردست کیرکٹر یعنے سیرت کی وجہ سے ہوی ورنہ کمال کی قدر جیسی کچھ ہوتی ہے وہ معلوم ہے یہ اُن کے صبر و استقلال اور استغنا و قناعت کی قوت تھی کہ اُن کے سامنے اچھوں اچھوں نے سر جھکائے اور زانوئے ادب تہ کئے یہانتک کہ نواب آصف الدولہ اور نواب سعادت علی خاں بھی اُن کا بڑا ادب و احترام کرتے اور بڑی عزت کے ساتھ پیش آتے تھے لیکن اُن کی نازک مزاجی اور بد دماغی کی کیفیت ان والیان ملک سے بھی وہی تھی جو اوروں کے ساتھ تھی اور صبر و قناعت اور غیرت و خود داری نے اس کی لے اور بڑھادی تھی حتی کہ بعض وقت وہ لوگ بھی جو ان کے دل سے قدرداں تھے اور ان کی نازبرداری کو اپنا فخر سمجھتے تھے ان کی بد دماغی سے عاجز آجاتے تھے وہ اپنے کمال کے سامنے کسی کی کوی حقیقت نہیں سمجھتے تھے اور جا و بیجا بد دماغی کر بیٹھتے تھے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود بھی اس سے واقف تھے۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

حالت تو یہ کہ مجھکو غموں سے نہیں فراغ — دل شورش درونی سے جلتا ہے جوں چراغ
سینہ تمام چاک ہے سارا جگر ہے داغ — ہے نام مجلسوں میں مرا میر بے دماغ

ازبسکہ کم دماغی نے پایا ہو اشتہار

ایک اور جگہ فرماتے ہیں ۔

تری چال ٹیڑھی تری بات روکھی
تجھے میر سمجھا ہے یاں کم کسو نے

اس نازک مزاجی اور خود داری کے ہاتھوں وہ زندگی سے بیزار رہے اور ہمیشہ دُکھ درد سہتے اور خون جگر کھاتے رہے اور اسی خون جگر سے انھوں نے زمین شعر کو سینچا۔ جو اب تک تر و تازہ ہے ۔

مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے
درد و غم کتنے کئے جمع تو دیوان کیا

افسوس کہ آرام و راحت ، زندہ دلی اور مسرت انکی قسمت میں نہ تھی اور انھوں نے اپنی زندگی اس دنیا میں ایک حرماں نصیب قیدی کی طرح کاٹی یہ معلوم ہوتا ہے کہ غم و الم کا ایک ابر سیہ ہمیشہ اُن پر چھایا ہوا ہے جس میں سے خوشی کی ایک کرن بھی چھن کر ان پر نہیں گرتی ۔ اور یہی رنگ ان کے اشعار سے ٹپکتا ہے گویا وہ اور اُن کا کلام ایک ہوگئے ہیں اور یہ انتہائے کمال شاعری ہے وہ اپنی اس کیفیت کو خود بیان کرتے ہیں

کیا ذکر ہمصفیران یاران شاد ماں کا | یا روئے یا رُلایا اپنی تو یونہی گزری
گلشن میں تھے تو ہم کو منصب تھا روضہ خواں کا | قید قفس میں ہیں تو خدمت ہے نالگی کی

ایک دوسری غزل کے چند اشعار ہیں ۔

یہ میر ستم کشتہ کسو وقت جواں تھا — انداز سخن کا سبب شور و فغاں تھا
جادو کی پڑی پرچۂ ابیات تھا اُس کا — منہ تکئے غزل پڑھتے عجب سحر بیاں تھا
جس راہ سے وہ دل زدہ دلّی میں نکلتا — ساتھ اُسکے قیامت کا سا ہنگامہ رواں تھا
افسردہ نہ تھا ایسا کہ جوں آب دہ خاک — آندھی تھا بلا تھا کوئی آشوب جہاں تھا
غافل تھے ہم احوال دل خستہ سے اپنے — وہ گنج اسی کنج خرابہ میں نہاں تھا

باوجود ان حالات کے انھوں نے خود داری کو کبھی ہاتھ سے نہیں دیا اور اضطراب میں بھی کوئی فعل اُن سے ایسا سرزد نہیں ہوتا جو اُن کی شان اور وضعداری کے خلاف ہوتا آج ہم اُن کی نازک مزاجی اور خود داری کے واقعات اور لطیفے شوق سے پڑھتے اور اُن پر فخر کرتے ہیں۔ اور اُن سے وہی لطف حاصل ہوتا ہے جو اُن کے کلام سے ہوسکتا ہے بلکہ اثر میں اُن کے حالات اُن کے کلام سے کہیں زیادہ ہیں خوب کہا ہے۔

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں ایسی نہ سنئے گا
پڑھتے کسی کو سنئے گا تو دیر تلک سر دھنئے گا

یہ وہ لوگ ہیں کہ باوجود مصائب و آلام کے اُن کے پائے ثبات کو لغزش نہ ہوی اور انھوں نے اپنے کلام کی عزت قایم رکھی اور اپنے افعال سے اس کو ذلیل نہیں کیا کمال کی وجہ سے انکی عزت نہیں ہوی بلکہ اُن کی وجہ سے اُن کے کمال کا رتبہ وہ چند بڑھ گیا اسی وجہ سے میر کی زندگی سبق آموز اور عبرت خیز ہے سبق اُن کیلئے

جو کسب کمال کی راہ میں گام زن ہیں اور اُن کے گرد و پیش موانعات اور سامنے ترغیبات کا جال بچھا ہوا ہے۔ یہی اُن کا امتحان ہے اُن پر لازم ہے کہ وہ رہ راست پر ثابت رہیں اور اپنے قدم میں لغزش نہ آنے دیں حیرت ہے اُن کے لئے جو اپنے کمال کو اپنی ہوس کے پورا کرنے کا ذریعہ قرار دیتے ہیں اور اُسے ایک دوکانداری سمجھتے ہیں اور اپنی بے حمیتی سے اپنے کمال کو بٹا لگاتے ہیں۔ اگر کسی میں ہزار کمال ہوں لیکن اس میں میر کی سی خودداری صبر و استقلال، غیرت اور وضعداری نہ ہو تو ایسے شخص کا وجود دنیا کے لئے بیکار اور خود اُس کے کمال کے لئے باعث ننگ و عار ہے۔ اُن بے تہوں[۱] کو جنھیں اتفاق سے ہلدی کی گرہ ہاتھ لگ جاتی ہے اور پنساری بن بیٹھتے ہیں، میر کی زندگی کا مطالعہ غور سے کرنا چاہئے۔ تب انھیں معلوم ہوگا کہ ایک صاحب کمال کے یتور ہی اور ہوتے ہیں۔

میر کا کلام اور اُن کی سیرت دونوں قابل مطالعہ ہیں اور دونوں نے مل کر میر کا رتبہ اردو شعرا میں نہایت بلند کردیا ہے ایسے باکمال اور صاحب سیرت لوگ کہیں مدتوں میں پیدا ہوتے ہیں اور اُن کا نقش

۱۔ بے تہ یہ خاص میر صاحب کا لفظ ہے انھوں نے اسے کم مایہ کے معنوں میں استعمال کیا ہے آج کل سطحی کا لفظ استعمال ہوتا ہے جو ایک انگریزی لفظ کا ترجمہ ہے اور بے تہ کے مقابلے میں بہت بھونڈا اور ثقیل ہے یہ لفظ استعمال کرنے اور رواج دینے کے قابل ہے

ایسا مستقل اور گہرا ہوتا ہے کہ زمانہ مٹا نہیں سکتا خوب کہا ہے

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

میر صاحب کو دربار داری اور اُمرا کی ملاقات سے طبعاً نفرت تھی۔ صاحب آب حیات لکھتے ہیں کہ

"گورنر جنرل اور اکثر صاحبانِ عالیشان جب لکھنؤ جاتے تو اپنی قدردانی سے یا اس سبب سے کہ ان کے میر منشی اپنے علوِ حوصلہ سے ایک صاحب کمال کی تقریب واجب سمجھتے تھے میر صاحب کو ملاقات کے لئے بلاتے مگر یہ پہلو تہی کرتے اور کہتے کہ مجھ سے جو کوئی ملتا ہے تو یا مجھ فقیر کے خاندان کے خیال سے یا میرے کلام کے سبب سے ملتا ہے۔ صاحب کو خاندان سے غرض نہیں، میرا کلام سمجھتے نہیں البتہ کچھ انعام دیں گے، ایسی ملاقات سے ذلت کے سوا کیا حاصل"

اس سے زیادہ قابل لحاظ ایک واقعہ صاحب گلشن ہند نے لکھا ہے جس کا یہاں نقل کرنا میں ضروری سمجھتا ہوں

"جن ایام میں کہ درخواست صاحب عالیشان کی زبان دانانِ ریختہ کے مقدمے میں کلکتے سے لکھنؤ گئی تو پہلے کرنل اسکاٹ صاحب کے روبرو تقریب میر کی ہوئی لیکن علت پیری سے یہ بیچارے مجہول کے مجہول ہوئے اور نوجوان نومشق مزاجی گرمی سے قوت بدنی کے مقبول ہوئے زمانہ خوش طبعوں سے نہیں خالی ہے۔ اکثر اہل لکھنؤ پکارتے تھے

کہ کلکتے میں شاعری کی جا درخواست خالی ہے ، کس واسطے کہ یہ جانتے سب اہل تمیز ہیں کہ آج بھی بوڑھے کے سامنے نوجوان غور کے میں موثر ہیں اب بھی جو بوجھ حکمت معنی کا جیسے ثقیل طبع سے ترازو کرکے وہ دکھاتا ہے جوان اگر کوہ بو قبیس ہے تو تحمل سے اسکے کر جاتا ہے غالباً اس جگہ کے لئے میر شیر علی افسوس کا انتخاب ہوا یہ اردو زبان کی بدنصیبی تھی کہ میر صاحب کا انتخاب نہ ہوسکا۔ چونکہ ان کی نظم میں غایت درجہ فصاحت و شیرینی اور سلاست اور گھلاوٹ پائی جاتی ہے اسلئے ممکن تھا کہ وہ فورٹ ولیم کالج میں جاکر نثر میں کوئی ایسی یادگار چھوڑ جاتے کہ اہل زبان ان کی نظم کی طرح اسے سر اور آنکھوں پر رکھتے اور میر امن کی چہار درویش کی طرح اردو ادب میں اسی کا نام روشن ہوتا۔

اب ایک سوال یہ باقی ہے کہ میر کی شاعری کا اثر ان کے ہمعصروں اور مابعد کے شاعروں پر کیا پڑا ؟ اگرچہ میر صاحب کی شاعری کی خود ان کے زمانے میں بے انتہا قدر ہوئی اور اب تک لوگ ان کی استادی کا لوہا مانتے ہیں لیکن حیرت ہے کہ ان کے آخر زمانے نیز مابعد کی شاعری پر میر کا مطلق اثر نہیں ہوا لکھنو کی شاعری کا رنگ بالکل جدا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل لکھنو میر کے کلام کی اس قدر دل سے داد دیتے تھے

اور جے پڑھ پڑھ کر جھومتے اور سر دھنتے تھے اس سے وہ مطلق متاثر نہ ہوے اور اس نے ایک جداگانہ روش اختیار کی جسے میر کے انداز سے کچھ نسبت نہیں ۔ مولانا حالی نے اپنے مقدمہ شاعری میں اس کی وجہ بتائی ہے جسے یہاں بجنسہ نقل کیا جاتا ہے ۔

" شجاع الدولہ کے زمانے سے سعادت علی خاں کے وقت تک اردو کے تمام نامور شعرا کا جگھٹا لکھنو ہی میں رہا یہاں تک کہ میر، سودا، سوز، جرات، مصحفی اور انشا وغیرہ اخیر دم تک وہیں رہے اور وہیں مرے ۔ مگر متاخرین کی غزل میں ان کے طرز بیان کا اثر بہت کم پایا جاتا ہے ۔ ظاہرا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب دلی بگڑ چکی اور لکھنو سے زمانہ موافق ہوا اور دلی کے اکثر شریف خاندان اور ایک آدھ کے سوا تمام نامور شعرا لکھنو ہی میں جا رہے اور دولت و ثروت کے ساتھ علوم قدیمہ نے بھی ایک خاص حد تک ترقی کی تو اس وقت نیچرل طور پر اہل لکھنو کو ضرور یہ خیال پیدا ہوا ہوگا کہ جس طرح دولت اور منطق و فلسفہ وغیرہ میں ہم کو فوقیت حاصل ہے اسی طرح زبان اور لب و لہجے میں بھی ہم دلی سے فایق رہیں لیکن زبان میں فوقیت ثابت کرنے کے لئے ضرور تھا کہ اپنی اور دلی کی زبان میں کوی امر مابہ الامتیاز پیدا کرتے ۔ چونکہ

منطق و فلسفہ و طب و علم کلام وغیرہ کی ممارست زیادہ
تھی خود بخود طبیعتیں اس بات کی مقتضی ہوئیں کہ بول
چال میں ہندی الفاظ رفتہ رفتہ ترک اور اُن کی جگہ
عربی الفاظ کثرت سے داخل ہونے لگے یہاں تک کہ
سیدھی سادی اردو امرا اور اہل علم کی سوسائٹی میں
متروک ہی نہیں ہوگئی بلکہ جیسا کہ ثقات سے سنا
گیا ہے معیوب اور بازاریوں کی گفتگو سمجھی جانے لگی
اور یہی رنگ رفتہ رفتہ نظم و نثر پر بھی غالب آگیا"
اصل بات یہ ہے کہ ملک کی شاعری اُس کے تمدن
کے تابع ہوتی ہے جو سوسائٹی جس رنگ میں ڈوبی
ہوی ہوتی ہے اسی کی جھلک اس کی نظم و نثر میں
آجاتی ہے اگر ہم اُس زمانے کے لکھنو کو دیکھیں اور
اُس کے تمدن پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ اہل لکھنو
کے کھانے پینے، رہنے سہنے، لباس و آداب و اطوار
غرض تمام طرز معاشرت میں سراسر تصنع اور تکلف
پایا جاتا تھا انھیں سوچ سمجھکر کسی خاص امتیاز کے پیدا
کرنے کی ضرورت نہ تھی بلکہ جو عام روش زندگی کے
ہر شعبے میں نظر آتی تھی، اُسی میں اُن کا علم ادب
بھی رنگا ہوا تھا، اس میں شک نہیں کہ منطق و فلسفہ
اور علم کلام کی ممارست نے اُن کے علم ادب پر
اثر ڈالا لیکن اس سے قبل دلی میں بھی ان علوم

کا چرچا تھا اور دور دور سے طالب علم ان علوم
کی تحصیل کے لئے وہاں آتے تھے لیکن وہاں کی بول
چال اور نظم و نثر پر کبھی ایسا برا اثر نہیں پڑا ۔
مگر اُس زمانے کے لکھنؤ کی ممتاز خصوصیت تصنع اور
تکلف تھی اور یہ اُن کے تمدن کے ہر پہلو اور ہر
شعبے میں صاف نظر آتی ہے وہ نئی تراش خراش اور
جدت پر مٹے ہوئے تھے اور عوام و خواص میں اُس کی
بڑی قدر ہوتی تھی ، اس لئے سب کے سب اُدھر ہی
ڈھل گئے اور ساری ہمت تکلفات میں صرف کر دی ۔
سادگی کی جگہ بناوٹ نے اور فطرت کی جگہ صنعت نے
لے لی ۔ میر اور اُن کے ہم عصروں کا اثر زائل ہو گیا
اور اُن کے بجائے دوسرے استاد پیدا ہوئے جو اُس
سوسائٹی کے سپوت اور اُس تمدن کے پروردہ تھے حضرت
ناسخ اور اُن کے بعد خواجہ وزیر صبا رشک اور امانت
وغیرہ کے کلام میں سوائے ضلع و جگت ، لفظی مناسبت
و تلازمہ اور دیگر تکلفات کے کچھ بھی نہیں ۔ نثر میں
اس کا سب سے عمدہ نمونہ مرزا رجب علی سرور
کا فسانۂ عجائب ہے اس دور کا اثر ایک مدت تک
رہا اور شاید اب بھی لکھنؤ کی سرزمین میں کہیں
کہیں باقی ہو ۔ لیکن یہ چلنے والی چیز نہ تھی آخر اس
کا زور ٹوٹا جس میں بیرونی اثر کو بھی دخل ہے سبب

مجروح اور مولانا حالی کے کلام میں کچھ کچھ میر کا
رنگ نظر آتا ہے نثر میں فورٹ ولیم کالج، مرزا
غالب سر سید احمد خاں، مولانا شبلی مولوی محمد حسین
آزاد وغیرہ نے ایک نئی روح پھونکی انجمن پنجاب نے
بھی اردو نظم و نثر کی اصلاح میں مدد دی۔ یہ اثر
زیادہ تر مغربی رنگ لئے پیدا کیا آج کل اردو پھر
ایک تذبذب کی حالت میں ہے ہندو مسلمان کے
اختلاف نے اردو پر بہت بڑا اثر ڈالا ہے ایک
فریق عربی پر تلا ہوا ہے اور دوسرا فریق سنسکرت
پر۔ دونوں غلطی پر ہیں زمانے کے اقتضاء سے
زبان بچ نہیں سکتی اور یہ اسی کا اثر ہے۔ لیکن
جو اسباب اس کے باعث ہوئے ہیں وہ سب عارضی
ہیں اور قایم رہنے والے نہیں جب لوگ اردو زبان
کی تاریخ، اس کی ابتدا اور اس کے نشو و نما پر
غور کریں گے اور زبان کے عمدہ نمونے ان کے پیش
نظر ہونگے تو وہ اس بیراہ روی سے خود بخود باز
آجائیں گے جس میں سب سے بڑی تقویت مغربی
تعلیم وہاں کے عمدہ نمونوں اور صحیح تنقیدی اصولوں
سے ملیگی اور گو میر کا حقیقی اور اصلی رنگ واپس
نہ آئے مگر اس کا کلام پھر بھی اسی شوق و ذوق
سے پڑھا جائے گا اور جس حسن و سادگی کو ہم بھولے

ہوے ہیں اُس کی یاد کو تازہ کرتا رہیگا اور ہمیں
بھٹکنے سے روکتا رہے گا یہ کیا کم احسان ہے ؟

بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق

Checked 1975

بسم اللہ الرحمن الرحیم

انتخاب غزلیات

ردیف الف

تھا مستعار حسن سے اُسکے جو نور تھا
خورشید میں بھی اُس ہی کا ذرہ ظہور تھا

ہنگامہ گرم کن جو دل ناصبور تھا
پیدا ہر ایک نالے سے شور نشور تھا

پہنچا جو آپ کو تو میں پہنچا خدا کے تئیں
معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دور تھا

آتش بلند دل کی نہ تھی ورنہ اے کلیم
یک شعلہ برق خرمن صد کوہ طور تھا

مجلس میں رات ایک ترے پرتوے بغیر
کیا شمع کیا پتنگ ہر اک بےحضور تھا

منعم کے پاس قاقم سنجاب تھا تو کیا
اُس رند کی بھی رات کٹی جو کہ عور تھا

ہم خاک میں ملے تو ملے لیکن اے سپہر
اُس شوخ کو بھی راہ پہ لانا ضرور تھا

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آ گیا
یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا

کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بےخبر
میں بھی کبھو کسی کا سر پُر غرور تھا

۵

تھا وہ نور شاہ

سمجھے نہ ہم

میر

ا

کیا میں بھی پریشانیٔ خاطر سے قریں تھا — آنکھیں تو کہیں تھیں دلِ غمدیدہ کہیں تھا
آیا تو سہی وہ کوئی دم کے لئے لیکن — ہونٹوں پہ مرے جب نفسِ بازپسیں تھا
شب کو فتے ہجر انکی جہاں تن پہ رکھا ہاتھ — جو درد و الم تھا سو کہے تو کہ وہیں تھا
نام آج کوئی یاں نہیں لیتا ہے انہوں کا — جن لوگوں کے کل ملک یہ سب زیرِ نگیں تھا

مسجد میں امام آج ہوا آکے وہاں سے
کل تک تو یہی میر خرابات نشیں تھا

لطف اگر یہ ہے بتاں صندل پیشانی کا — حسن کیا صبح کے پھر چہرۂ نورانی کا
کفر کچھ چاہئے اسلام کی رونق کیلئے — حسن زنار ہے تسبیح سلیمانی کا
درہمی حال کی ہے سارے مرے دیواں میں — سیر کر تو بھی یہ مجموعہ پریشانی کا
جان گھبراتی ہے اندوہ سے تن میں کیا کیا — تنگ احوال ہے اس یوسف زندانی کا
کھیل لڑکوں کا سمجھتے تھے محبت کے تئیں — ہے بڑا حیف ہمیں اپنی بھی نادانی کا
اس کا منہ دیکھ رہا ہوں سو وہی دیکھوں ہوں — نقش کا سا ہے سماں میری بھی حیرانی کا

بت پرستی کو تو اسلام نہیں کہتے ہیں
معتقد کون ہے میر ایسی مسلمانی کا

جامۂ ہستیٔ عشق اپنا مگر کم گھیر تھا — دامن تر کا مرے دریا ہی کا سا پھیر تھا
دیر میں کعبہ گیا میں خانقہ سے اب کے بار — راہ سے میخانے کی اس راہ میں کچھ پھیر تھا

بلبلوں نے کیا گل افشاں میر کا مرقد کیا
دور … نکا یک ڈھیر تھا

اس عہد میں الٰہی محبت کو کیا ہوا ۔ چھوڑا وفا کو اُن نے مروت کو کیا ہوا
امیدوار وعدۂ دیدار مر چلے ۔ آتے ہی آتے یارو قیامت کو کیا ہوا
بخشش نے مجھکو ابر کرم کی کیا خجل ۔ اے چشم جوشِ اشک ندامت کو کیا ہوا
جاتا ہے یار تیغ بکف غیر کی طرف ۔ اے کشتۂ ستم تری غیرت کو کیا ہوا

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات ۔ کلی نے یہ سُن کر تبسم کیا
جگر ہی میں یک قطرہ خوں ہے سرشک ۔ پلک تک گیا تو تلاطم کیا

اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا ۔ دیکھا اس بیماریِ دل نے آخر کام تمام کیا
عہدِ جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند ۔ یعنے رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا
ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی ۔ چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا
کس کا کعبہ کیسا قبلہ کون حرم ہے کیا احرام ۔ کوچے کے اُسکے باشندوں نے سبکو یہیں سے سلام کیا
یانکے سپید و سیہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے ۔ رات کو رو رو صبح کیا یا دن کو جوں توں شام کیا

میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو اُننے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

چمن میں گل نے جو کل دعوئے جمال کیا ۔ جمالِ یار نے منہ اُس کا خوب لال کیا
بہار رفتہ پھر آئی ترے تماشے کو ۔ چمن کو یمنِ قدم نے ترے نہال کیا

لگا نہ دل کو کہیں کیا سنا نہیں تو نے
جو کچھ کہ میر کا اس عاشقی نے حال کیا

بنا ظلم کی رکھ گھر تو بنایا ۔ پر آپ کوئی رات ہی مہمان رہے گا
ں کہیں ایذا سے لگا ایک ہی جلاد ۔ تا حشر مرے سر پہ یہ احسان رہے گا
ہگے دشت محبت میں سر تیغ ۔ محشر تئیں خالی نہ یہ میدان رہے گا
بس شور سخن کا مرے ہرگز ۔ تا حشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا

سر کو غرور آج ہے یاں تاجوری کا ۔ کل اس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا
ں کی منزل سے گیا کون سلامت ۔ اسباب لٹا راہ میں یاں ہر سفری کا
زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی ۔ اب سنگ مداوا ہے اِس آشفتہ سری کا
ہر زخم جگر داور محشر سے ہمارا ۔ انصاف طلب ہے تری بیدادگری کا
اپنی تو جہاں آنکھ لڑی پھر وہیں دیکھو ۔ آئینے کو لپکا ہے پریشاں نظری کا
صد موسم گل ہم کو تہ بال ہی گذرے ۔ مقدور نہ دیکھا کبھو بے بال پری کا

ٹک میر جگر سوختہ کی جلد خبر لے
کیا یار بھروسہ ہے چراغ سحری کا

منہ تکا ہی کرے ہے جس تس کا ۔ حیرتی ہے یہ آئینہ کس کا
شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے ۔ دل ہوا ہے چراغ مفلس کا
تھے بُرے مغبچوں کے تیور لیک ۔ شیخ میخانے سے بھلا کھسکا
فیض اے ابر چشم تر سے اُٹھا ۔ آج دامن وسیع ہے اِس کا

تاب کس کو جو حال میر سنے
حال ہی اور کچھ ہے مجلس کا

دعویٰ کیا تھا گل نے ترے مُنھ سے باغ میں
سیلی لگی صبا کی سو مُنہ لال ہو گیا

پودھا ستم کا جس نے اِس باغ میں لگایا
اپنے کئے کا اُس نے ثمرہ شتاب دیکھا
آباد جس میں تجھکو دیکھا تھا ایک مدت
اس دل کی مملکت کو اب ہم خراب دیکھا

لیتے ہی نام اُس کا سوتے سے چونک اٹھا
ہے خیر میر صاحب کچھ تم نے خواب دیکھا

مر رہتے جو گل بن تو سارا یہ خلل جاتا
نکلا ہی نہ جی ورنہ کانٹا سا نکل جاتا
میں گریۂ خونی کو روکے ہی رہا ورنہ
یکدم میں زمانے کا یاں رنگ بدل جاتا
بن پوچھے کرم سے وہ جو بخش نہ دیتا تو
پرسش میں ہماری ہی دن حشر کا ڈھل جاتا

مانند شمع مجلس شب اشکبار پایا
القصّہ میر کو ہم بے اختیار پایا
احوال خوش اُنھوں کا ہم بزم ہیں جو تیرے
افسوس ہے کہ ہم نے واں کا نہ بار پایا
شہر دل ایک مدت اجڑا بسا غموں میں
آخر اجاڑ دینا اُس کا قرار پایا
اتنا نہ دل سے ملتے نادل کو کھو کے روتے
جیسا کیا تھا ہم نے ویسا ہی یار پایا
کیا اعتباریاں کا پھر اس کو خوار دیکھا
جس نے جہاں میں آکر کچھ اعتبار پایا

آہوں کے شعلے جب اُٹھے ہیں میر سے شب
واں جا کے صبح دیکھا مشت غبار پایا

یار وے یار لایا اپنی تو یونہی گزری
کیا ذکر ہم صفیراں یارانِ شادماں کا
قید قفس میں ہیں تو خدمت ہے نالگی کی
گلشن میں تھے تو ہم کو منصب تھا روضہ خواں کا

پوچھو تو میر سے کیا کوئی نظر پڑا ہے — چہرہ اُتر رہا ہے کچھ آج اس جواں کا

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا — دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں — تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

اگرچہ گوشہ گزیں ہوں میں شاعروں میں میر — پہ میرے شور نے روئے زمیں تمام لیا

سیر کے قابل ہے دلِ صد پارہ اُس نخچیر کا — جسکے ہر ٹکڑے میں ہو پیوست پیکاں تیر کا

سب کھلا باغِ جہاں الّا یہ حیران و خفا — جسکو دل سمجھے تھے ہم سو غنچہ تھا تصویر کا

کیونکہ نقاشِ ازل نے نقشِ ابرو کا کیا — کام ہے اک تیرے منہ پر کھینچنا شمشیر کا

رہگذر سیلِ حوادث کا ہے بے بنیاد دہر — اس خرابے میں نہ کرنا فکر تم تعمیر کا

بس طبیب اُٹھ جا مرے بالیں سے مت دے دردِ سر — کام یاں آخر ہوا اب فائدہ تدبیر کا

کس طرح سے مانئے یارو کہ یہ عاشق نہیں — رنگ اُڑا جاتا ہے ٹک چہرہ تو دیکھو میر کا

موجیں کرے ہے بحرِ جہاں میں ابھی تو تو — جانے گا بعدِ مرگ کہ عالم حباب تھا

اُگتے تھے دستِ بلبل و دامانِ گل بہم — صحنِ چمن نمونۂ یوم الحساب تھا

ٹک دیکھ آنکھیں کھول کے اس دم کی حسرتیں — جس دم یہ سوجھے گی کہ یہ عالم بھی خواب تھا

گل کو محبوب میں قیاس کیا — فرق نکلا بہت جو باس کیا

دل نے ہم کو مثالِ آئینہ — ایک عالم کا روشناس کیا

کچھ نہیں سوجھتا ہمیں اس بن — شوق نے ہم کو بے حواس کیا

صبح تک شمع سر کو دھنتی رہی — کیا پتنگے نے التماس کیا

ایسے وحشی کہاں ہیں اے خوباں | میر کو تم عبث اداس کیا

داغِ فراق وحسرتِ وصل آرزوئے شوق | میں ساتھ زیرِ خاک بھی ہنگامہ لے گیا

اے تو کہ یاں سے عاقبتِ کار جائیگا | غافل نہ رہ کہ قافلہ یکبار جائے گا
موقوف حشر پر ہے سو آتے بھی وے نہیں | کب درمیاں سے وعدۂ دیدار جائے گا
آنے میں اسکے حال ہوا جائے ہے تغیر | کیا حال ہوگا پاس سے جب یار جائیگا

جو سنا ہشیار اس میخانے میں تھا بے خبر | شوق ہی باقی نہ رہا ہم کو دلِ آگاہ کا
باندھ مت رونیکا تار اے ناقباحت فہم چشم | اس سے پایا جائے ہے سر رشتہ جی کی چاہ کا

ہے اسکے حرفِ زیرِ لبی کا سبھوں میں ذکر | کیا بات تھی کہ جس کا یہ بستار ہو گیا

ہم خستہ دل ہیں تجھ سے بھی نازک مزاج تر | تیوری چڑھائی تو نے کہ یاں جی نکل گیا
گرمیٔ عشق مانعِ نشو ونما ہوئی | میں وہ نہال تھا کہ اگا اور جل گیا
مستی میں چھوڑ دیر کو کعبہ چلا تھا میں | لغزش بڑی ہوئی تھی ولیکن سنبھل گیا

ملا ہے خاک میں کس کسطرح کا عالم یاں | نکل کے شہر سے ٹک سیر کر مزاروں کا
تڑپ کے مرنیسے دل کے کہ مغفرت ہو اسے | جہاں میں کچھ تو رہا نام بے قراروں کا
تڑپ کے خرمنِ گل پر کہیں گر اے بجلی | جلانا کیا ہے مرے آشیانے کے خاروں کا
تمہیں تو زہد و ورع پر بہت ہے اپنے غرور | خدا ہے شیخ جی ہم بھی گنہگاروں کا

گزرا بنائے چرخ سے نالہ پگاہ کا | خانہ خراب ہو جیو اس دل کی چاہ کا
آنکھوں میں جی مرا ہے اِدھر دیکھتا نہیں | مرتا ہوں میں تو ہائے رے صرفہ نگاہ کا
یک قطرہ خون ہو کے پلک سے ٹپک پڑا | قصّہ یہ کچھ ہُوا دلِ غفراں پناہ کا
بدنام و خوار و زار و نزار و شکستہ حال | احوال کچھ نہ پُوچھئے اِس روسیاہ کا
ظالم زمیں سے لوٹتا دامن اُٹھا کے چل | ہوگا کسی میں ہاتھ کسو دادخواہ کا
اے تاجِ شہ نہ سر کو فرو لاؤں تیرے پاس | ہے معتقد فقیر نمد کی کلاہ کا

دل سے شوقِ رُخِ نکو نہ گیا | جھانکنا تاکنا کبھو نہ گیا
ہر قدم پر تھی اُس کی منزل لیک | سر سے سودائے جستجو نہ گیا
سب گئے ہوش و صبر و تاب و تواں | لیکن اے داغ! دل سے تو نہ گیا
دل میں کتنے مسوّدے تھے ولے | ایک پیش اُس کے روبرو نہ گیا
سبحہ گرداں ہی میرؔ ہم تو رہے | دستِ کوتاہ تا سبو نہ گیا

دمِ صبح بزمِ خوشِ جہاں شبِ غم سے کم نہ تھی مہرباں
کہ چراغ تھا سو تو دود تھا جو پتنگ تھا سو غبار تھا

دلِ خستہ جو لہو ہو گیا تو بھلا ہُوا کہ کہاں تلک
کبھو سوزِ سینہ سے داغ تھا کبھو دردِ غم سے فگار تھا

دلِ مضطرب سے گزر گئی شبِ وصل اپنے ہی فکر میں
نہ دماغ تھا نہ فراغ تھا نہ شکیب تھا نہ قرار تھا

یہ تمہاری ان دنوں دوستاں مژہ جس کے غم میں ہے خونچکاں
وہی آفتِ دلِ عاشقاں کسو وقت ہم سے بھی یار تھا

نہیں تازہ دل کی شکستگی یہی درد تھا یہی خستگی
اُسے جب سے ذوقِ شکار تھا اُسے زخم سے سروکار تھا
کبھو جائے گی جو ادھر صبا تو یہ کہیو اُس سے کہ بے وفا
مگر ایک میرِ شکستہ پا ترے باغِ تازہ میں خار تھا

مہر کی تجھ سے توقع تھی ستمگر نکلا — موم سمجھے تھے ترے دل کو سو پتھر نکلا
اشک تر قطرۂ خوں لختِ جگر پارۂ دل — ایک سے ایک عدد آنکھ سے بہتر نکلا
ہم نے جانا تھا لکھے گا تو کوئی حرف اے میر — پر ترا نامہ تو اک شوق کا دفتر نکلا

پھوڑا سا ساری رات جو پکتا رہے گا دل — تو صبح تک تو ہاتھ لگایا نہ جائے گا
اب دیکھ لے کہ سینہ بھی تازہ ہوا ہے چاک — پھر ہم سے اپنا حال دکھایا نہ جائیگا
گو بے ستوں کو ٹال دے آگے سے کوہکن — سنگِ گرانِ عشق اُٹھایا نہ جائے گا
یاد اُس کی اتنی خوب نہیں میر باز آ — نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائیگا

دُنیا کی نہ کر تو خواستگاری — اِس سے کبھو بہرہ ور نہ ہوگا
آ خانہ خرابی اپنی مت کر — قحبہ ہے یہ اِس سے گھر نہ ہوگا

مت رنجہ کر کسی کو کہ اپنے تو اعتقاد — دِل ڈھائے کر جو کعبہ بنایا تو کیا ہُوا
میں صید ناتواں ہُوں تجھے کیا کروگے یاد — ظالم یک اور تیر لگایا تو کیا ہُوا
کیا کیا دعائیں مانگی ہیں خلوت میں شیخ یوں — ظاہر جہاں سے ہاتھ اُٹھایا تو کیا ہُوا
وہ فکر کر کہ چاکِ جگر پاوے التیام — ناصح جو تو نے جامہ سلایا تو کیا ہُوا

جیتے تو میر اُن نے مجھے داغ ہی رکھا — پھر گور پر چراغ جلایا تو کیا ہوا

دل جو تھا اک آبلہ پھوٹا گیا — رات کو سینہ بہت کوٹا گیا
میں نہ کہتا تھا کہ منہ کر دل کی اور — اب کہاں وہ آئینہ ٹوٹا گیا
دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے — یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا
میر کس کو اب دماغِ گفتگو — عمر گذری ریختہ چھوٹا گیا

اے دوست کوئی مجھ سا رسوا نہ ہوا ہوگا — دشمن کے بھی دشمن پر ایسا نہ ہوا ہوگا
ٹک گورِ غریباں کی کر سیر کہ دُنیا میں — اِن ظلم رسیدوں پر کیا کیا نہ ہوا ہوگا
اِس کہنہ خرابی میں آبادی نہ کر منعم — ایک شہر نہیں یاں جو صحرا نہ ہوا ہوگا
آنکھوں سے تری ہم کو ہے چشم کہ اب ہووے — جو فتنہ کہ دُنیا میں برپا نہ ہوا ہوگا
جز مرتبۂ کل کو حاصل کرے ہے آخر — یک قطرہ نہ دیکھا جو دریا نہ ہوا ہوگا

حق ڈھونڈنے کا آپ کو آتا نہیں ورنہ — عالم ہے سبھی یار کہاں یار نہ پایا
مربوط ہیں تجھ سے بھی یہی ناکس و نا اہل — اِس باغ میں ہم نے گلِ بے خار نہ پایا

خواہ مجھ سے لڑ گیا اب خواہ مجھ سے مل گیا — کیا کہوں اے ہم نشیں میں تجھ سے حاصل دل گیا
دل سے آنکھوں میں لہو آتا ہے شاید رات کو — کشمکش میں بیقراری کی یہ پھوڑا اچھل گیا
اپنے ہی دل کو نہ ہو واشد تو کیا حاصل نسیم — گو چمن میں غنچۂ پژمردہ مجھ سے کھل گیا

رشک کی جاگہ ہے مرگ اُس کشتۂ حسرت کی میر
نعش کے ہمراہ جس کی گور تک قاتل گیا

دشمنی ہم سے کی زمانے نے
جو جفا کار تجھ سا یار کیا

یہ تو ہم کا کارخانہ ہے
یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

صدرگِ جاں کو تاب دے باہم
تیری زلفوں کا ایک تار کیا

ہم فقیروں سے بے ادائی کیا
آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا

سخت کافر تھا جس نے پہلے میرؔ
مذہبِ عشق اختیار کیا

دو دن گئے کہ آنکھیں دریا سی بہتیاں تھیں
سو کھا پڑا ہے اب تو مدت سے یہ دو آبا

ان صحبتوں میں آخر جانیں ہی جاتیاں ہیں
لے عشق کو ہے صرفہ نے حسن کو محابا

قطعہ

آئی نظر جو گورِ سلیماں کی ایک روز
لوحے پر اُس مزار کے تھا یہ رقم ہُوا

کلّے سرکشاں جہاں میں کھینچا تھا میں بھی سر
پایانِ کار مور کی خاکِ قدم ہوا

کیا کیا عزیز دوست ملے میرؔ خاکیں
نادان یاں کسو کا کسو کو بھی غم ہُوا

دل دماغ ہے اب کس کو زندگانی کا
جو کوئی دم ہے تو افسوس ہے جوانی کا

اگرچہ عمر کی دس دن سے لب ہے خاموش
سخن رہے گا سدا میری کم زبانی کا

ہزار جان سے قربان بے پری کے میں
خیال بھی کبھی گزرا نہ پرفشانی کا

نمود کر کے وہیں بحرِ غم میں بیٹھ گیا
کہے تو میرؔ بھی یک بلبلا تھا پانی کا

بتاں کے عشق نے بے اختیار کر ڈالا
وہ دل کہ جس کا خدائی میں اختیار رہا

وُہ دل کہ شام و سحر جیسے پکّا پھوڑا اتھا ... وُہ دل کہ جس سے ہمیشہ جگر فگار رہا
تمام عمر کٹی اِس پہ ہاتھ رکھتے ہمیں ... وُہ دردناک علی الرغم بے قرار رہا
ستم میں غم میں سرانجام اسکا کیا کہیے ... ہزاروں حسرتیں تھیں تسپہ جی کو مار رہا
بہا تو خون ہو آنکھوں کی راہ بہ نکلا ... رہا جو سینۂ سوزاں میں داغدار رہا
سو اس کو ہم سے فراموش کاریوں لیگئے ... کہ اُس سے قطرۂ خُوں بھی نہ یادگار رہا
گلی میں اُسکے گیا سو گیا نہ بولا پھر ... میں میرؔ میر کر اُس کو بہت پکار رہا

جیتے جی کُوچۂ دلدار سے جایا نہ گیا ... اُس کی دیوار کا سر سے مرے سایہ نہ گیا
دل کے تیں آتشِ ہجراں سے بچایا نہ گیا ... گھر جلا سامنے پر ہم سے بجھایا نہ گیا
دلمیں رہ دل میں کہ معمارِ قضا سے ایک ... ایسا مطبوع مکاں کوئی بنایا نہ گیا
کیا تنک حوصلہ تھے دیدہ و دِل اپنے آہ ... ایکدم رازِ محبت کا چھپایا نہ گیا
دل جو دیدار کا قاتل کے بہت بھوکا تھا ... اِس ستم کشتہ سے یک زخم بھی کھایا نہ گیا
شہرِ دل آہ عجب جائے تھی پر اُسکے گئے ... ایسا اُجڑا کہ کسی طرح بسایا نہ گیا
سرنشینِ رہِ میخانہ ہُوں میں کیا جانوں ... رسمِ مسجد کیتئیں شیخ کہ آیا نہ گیا

گریباں سے رہا کوتہ تو پھر ہے ... تمہارے ہاتھ میں دامن ہمارا
بلا جس چشم کو کہتے ہیں مردم ... وُہ ہے عینِ بلامسکن ہمارا
ہُوا رونے سے رازِ دوستی فاش ... ہمارا گریہ تھا دشمن ہمارا
کیا تھا ریختہ پردہ سخن کا ... سو ٹھیرا ہے یہی اب فن ہمارا

گلیوں میں ابتلک بھی مذکور ہے ہمارا ... افسانۂ محبت مشہور ہے ہمارا

مقصود کو تو دیکھیں کبتک پہنچتے ہیں ہم — بالفعل اب ارادہ تاگور ہے ہمارا
ہیں مشت خاک لیکن جو کچھ ہیں میرؔ ہم ہیں — مقدور سے زیادہ مقدور ہے ہمارا

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا — آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا
قافلے میں صبح کے اک شور ہے — یعنے غافل ہم چلے سوتا ہے کیا
سبز ہوتی ہی نہیں یہ سرزمیں — تخمِ خواہش دل میں تو بوتا ہے کیا
یہ نشانِ عشق ہیں جاتے نہیں — داغ چھاتی کے عبث دھوتا ہے کیا
غیرتِ یوسف ہے یہ وقتِ عزیز — میرؔ اس کو رائیگاں کھوتا ہے کیا

ہم نہ کہتے تھے کہ مت دیر و حرم کی راہ چل — اب یہ دعویٰ حشر تک شیخ و برہمن میں رہا

رنگ اڑ چلا چمن میں گلوں کا تو کیا نسیم — ہم کو تو روزگار نے بے بال و پر کیا
نافع جو تھیں مزاج کو اول سو عشق میں — آخر انہیں دواؤں نے ہم کو ضرر کیا
کیا جانوں بزمِ عیش کہ ساقی کی چشم دیکھ — میں صحبتِ شراب سے آگے سفر کیا
جس دم کہ تیغِ عشق کھچی بوالہوس کہاں — سن لیجیے کہ ہم ہی نے سینہ سپر کیا
وہ دشت خوفناک رہا ہے مرا وطن — سن کر جسے خضر نے سفر سے حذر کیا

ہاتھ سے تیرے اگر میں ناتواں مارا گیا — سب کہینگے یہ کہ کیا؟ اک نیمجاں مارا گیا
اک نگہ سے بیش کچھ نقصان آیا اسکے تئیں — اور میں بیچارہ تو اے مہرباں مارا گیا
وصل و ہجراں سے جو دو منزل ہیں راہِ عشق کی — دلِ غریب ان میں خدا جانے کہاں مارا گیا
جس نے سر کھینچا دیارِ عشق میں اے بوالہوس — وہ سراپا آرزو آخر جواں مارا گیا

اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا — لہو آتا ہے جب نہیں آتا

ہوش جاتا نہیں رہا لیکن — جب وہ آتا ہے تب نہیں آتا

صبر تھا ایک مونس ہجراں — سو وہ مدت سے اب نہیں آتا

دل سے رخصت ہوئی کوئی خواہش — گریہ کچھ بے سبب نہیں آتا

عشق کو حوصلہ ہے شرط ارنہ — بات کا کس کو ڈھب نہیں آتا

جی میں کیا کیا ہے اپنے اے ہمدم — پر سخن تا بلب نہیں آتا

سحر گہ عید میں دور سبو تھا — پر اپنے جام میں تجھ بن لہو تھا

غلط تھا آپ سے غافل گزرنا — نہ سمجھے ہم کہ اس قالب میں تو تھا

چمن کی وضع نے ہم کو کیا داغ — کہ ہر غنچہ دل پر آرزو تھا

گل و آئینہ کیا خورشید و مہ کیا — جدھر دیکھا تدھر تیرا ہی رو تھا

کرو گے یاد باتیں تو کہو گے — کہ کوئی رفتۂ بسیار گو تھا

جہاں پر ہے فسانے سے ہمارے — دماغ عشق ہم کو بھی کبھو تھا

مگر دیوانہ تھا گل بھی کسو کا — کہ پیراہن میں سو جا گہ رفو تھا

نہ دیکھا میر آوارہ کو لیکن — غبار اک ناتواں سا کو بکو تھا

رہ طلب میں گرے ہوتے سر کے بل ہم بھی — شکستہ پائی نے اپنی ہمیں سنبھال لیا

نہ دے زنجیر کے غل ہیں نئے جرگے غزالوں کے — مرے دیوان پن تک ہی رہا معمور ویرانا

مرا سر نزع میں زانو پہ رکھ کر یوں لگا کہنے — کہ اے بیمار میرے تجھ پہ جلد آساں ہو مرجانا

نہ ہو کیوں ریختہ بے شورش و کیفیت و معنی — گیا ہو میر دیوانہ رہا سودا سو مستانا

قدر رکھتی نہ تھی متاعِ دلؔ
سارے عالم کو میں دکھا لایا

دل کہ یک قطرہ خوں نہیں ہے بیش
ایک عالم کے سر بلا لایا

لب پہ جس بار نے گرانی کی
اس کو یہ ناتواں اُٹھا لایا

دل مجھے اُس گلی میں لیجا کر
اور بھی خاک میں ملا لایا

ابتدا ہی میں مر گئے سب یار
عشق کی کون انتہا لایا

اب تو جاتے ہیں بتکدے سے میرؔ
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

یک وہم سی رہی ہے اپنی نمود تن میں
آتے ہو اب تو آؤ پھر ہم میں کیا رہیگا

مذکورِ یار ہم سے مت ہمنشیں کیا کر
دل جو بجا نہیں ہے پھر اسمیں جا رہیگا

تفحّص فائدہ ناصح تدارک تجھ سے کیا ہوگا
وُہی پاوے گا میرا درد۔ دل جسکا لگا ہوگا

معیشت ہم فقیروں کی سی اخوانِ زماں سے کر
کوئی گالی بھی دے تو کہہ بھلا بھائی بھلا ہوگا

قیامت کر کے اب تعبیر جسکو کرتی ہے خلقت
وہ اِس کوچے میں اک آشوب سا شاید ہوا ہوگا

کہیں ہیں میرؔ کو مارا گیا شب اُسکے کوچے میں
کہیں وحشت میں شاید بیٹھے بیٹھے اُٹھ گیا ہوگا

اپنے تڑپنے کی میں تدبیر پہلے کر لوں
تب فکر میں کروں گا زخموں کے بھی رفو کا

یہ عیش گہہ نہیں ہے یاں رنگ اور کچھ ہے
ہر گُل ہے اِس چمن میں ساغر بھرا لہو کا

بلبل غزل سرائی آگے ہمارے مت کر
سب ہم سے سیکھتے ہیں انداز گفتگو کا

سب سے مل جُل کہ حادثہ ہے پھر
کہیں ڈھونڈا بھی تو نہ پایئے گا

کہئے گا اُس سے قصۂ مجنوں
یعنے پردے میں غم سنایئے گا

شرکت شیخ و برہمن سے میر — کعبہ و دیر سے بھی جائیے گا
اپنی ڈیڑھ اینٹ کی جدی مسجد — کسی ویرانے میں بنائیے گا

دل پہنچا ہلاکی کو نپٹ کھینچ کسالا — لے یار مرے سلمہ اللہ تعالیٰ
کچھ میں نہیں اس دل کی پریشانی کا باعث — برہم ہی مرے ہاتھ لگا تھا یہ رسالا
معمور شرابوں سے کبابوں سے ہے سب دیر — مسجد میں ہے کیا شیخ؟ پیالہ نہ نوالا
گزرے ہے لہو واں سر ہر خار سے اب تک — جس دشت میں پھوٹا ہے مرے پاؤں کا چھالا
جس گھر میں ہو جلوے سے ترے چاندنی کا فرش — واں چادر مہتاب ہے مکڑی کا سا جالا
دیکھے ہے مجھے دیدۂ پرخشم سے وہ میر — میرے ہی نصیبوں میں تھا یہ زہر کا پیالا

شہرۂ عالم اسے یمن محبت نے کیا — ورنہ مجنوں ایک خاک افتادۂ ویرانہ تھا
اک نگاہ آشنا کو بھی وفا کرتا نہیں — وا ہوئی مژگاں کہ سبزۂ بیگانہ تھا
روز و شب گزرے ہے پیچ و تاب میں رہتے ہوئے — اے دل صد چاک کس کی زلف کا تو شانہ تھا
یاد آیا مے کدہ اپنے روز و شب کی جائے باش — یاد یار زیبایاں یا در میخانہ تھا
غیر کے کہنے سے مارا آنے ہمکو بیگناہ — یہ نہ سمجھا وہ کہ واقع میں بھی تھا کچھ یا نہ تھا
شب فروغ بزم کا باعث ہوا تھا حسن دوست — شمع کا جلوہ غبار دیدۂ پروانہ تھا

شریف مکہ رہا ہے تمام عمر اے شیخ — یہ میر اب جو گدا ہے شراب خانے کا

دیر و حرم سے گزرے اب دل ہے گھر ہمارا — ہے ختم اس آبلے پر سیر و سفر ہمارا
دنیا و دیں کی جانب میلان ہو تو کہیے — کیا جانیے کہ اس بن دل ہے کدھر ہمارا

جوں صبح اب کہاں ہے طولِ سخن سے فرصت
قصہ ہی کوئی دم کو ہے مختصر ہمارا

کوچے میں اُسکے جاکر بنتا نہیں پھر آنا
خوں ایک دن گریگا اِس خاک پر ہمارا

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا
دل کے جانے کا نہایت غم رہا

حسن تھا تیرا بہت عالم فریب
خط کے آنے پر بھی اِک عالم رہا

جامۂ احرام زاہد پر نہ جا
تھا حرم میں لیک نامحرم رہا

میرے رونے کی حقیقت جس میں تھی
ایک مدت تک وہ کاغذ نم رہا

صبح پیری شام ہونے آئی میر
تو نہ چیتا یاں بہت دن کم رہا

ہر حرفِ غم نے میرے مجلس کیتیں رُلایا
گویا غبارِ دل کا پڑھتا کتاب نکلا

آیا جو واقعے میں درپیش عالمِ مرگ
یہ جاگنا ہمارا دیکھا تو خواب نکلا

چوری میں دل کی وہ ہنر کر گیا
دیکھتے ہی آنکھوں میں گھر کر گیا

دہر میں میر خاک بسر ہی رہا
عمر کو اِس طور بسر کر گیا

کس کو مرے حال سے تھی آگہی
نالۂ شب سب کو خبر کر گیا

مجلسِ آفاق میں پروانہ ساں
میر بھی شام اپنی سحر کر گیا

سرسری تم جہان سے گزرے
ورنہ ہر جا جہان دیگر تھا

دل کی کچھ قدر کرتے رہیو تم
یہ ہمارا بھی ناز پرور تھا

بارے سجدہ ادا کیا تہ تیغ
کب سے یہ بوجھ میرے سر پر تھا

اب خرابہ ہوا جہاں آباد
ورنہ ہر ایک قدم پہ یاں گھر تھا

قطعہ

بے زری کا نہ کر گلہ غافل ۔ رہ تسلی کہ یوں مقدر تھا
اتنے منعم جہان میں گزرے ۔ وقت رحلت کسی کنے زر تھا
صاحب جاہ و شوکت و اقبال ۔ یک ازاں جملہ اب سکندر تھا
تھی یہ سب کائنات زیر نگیں ۔ ساتھ مور و ملخ سا لشکر تھا
لعل و یاقوت ہم زر و گوہر ۔ چاہیے جس قدر میسر تھا
آخر کار جب جہاں سے گیا ۔ ہاتھ خالی کفن سے باہر تھا
عیب طول کلام مت کر تو ۔ کیا کروں میں سخن سے خوگر تھا
خوش رہا جب تلک رہا جیتا ۔ میر معلوم ہے قلندر تھا

ماہیت دو عالم کھاتی پھری ہے غوطے ۔ یک قطرہ خوں یہ دل کا طوفان ہے ہمارا
کیا خانداں کا اپنے تجھ سے کہیں تقدس ۔ روح القدس اک ادنیٰ دربان ہے ہمارا
کرتا ہے کام وہ دل جو عقل میں نہ آوے ۔ گھر کا مشیر کتنا نادان ہے ہمارا

سارے سفید ہیں اعضا ہیں معرض تلف میں ۔ یہ عشق بے محابا کس کو امان دے گا
پاسے جو آبلے ہیں گم شدہ گیا ہوں ۔ ہر خار بادیے کا میرا نشان دے گا
نالہ ہمارا ہر شب گزرے ہے آسماں سے ۔ فریاد پر ہماری کس دن تو کان دے گا

کل چمن میں گل و سمن دیکھا ۔ آج دیکھا تو باغ بن دیکھا
کیا ہے گلشن میں جو قفس میں نہیں ۔ عاشقوں کو جلا وطن دیکھا
ذوق پیکان و تیر میں تیرے ۔ مدتوں تک جگر نے چھن دیکھا

ایک چشمک دو صد سنانِ مژہ — اُس نکیلے کا بانکپن دیکھا
حسرت اُس کی جگہ تھی خوابیدہ — میرؔ کا کھول کر کفن دیکھا

جہاں کو فتنے سے خالی کبھو نہیں پایا — ہمارے وقت میں تو آفت زمانہ ہوا
خلش نہیں کسو خواہش کی رات سے شاید — سرشک یاس کے پردے میں دل روانہ ہوا
کھلا نشے میں جو پگڑی کا پیچ اُس کے میرؔ — سمندِ ناز پہ اک اور تازیانہ ہوا

جی تو ایسے کئی صدقے کئے تجھ پہ لیکن — حیف یہ ہے کہ ٹک تو بھی پشیماں نہ ہوا
آہ میں کب کی کہ سرمایۂ دوزخ نہ ہوئی — کونسا اشک مرا منبعِ طوفاں نہ ہوا

قطعہ

گو توجہ سے زمانے کی جہاں میں مجھ کو — جاہ و ثروت کا میسر سر و ساماں نہ ہوا
شکر صد شکر کہ میں ذلت و خواری کے سبب — کسی عنوان میں ہم چشم عزیزاں نہ ہوا

کیسا چمن کہ ہم سے اسیروں کو منع ہے — چاکِ قفس سے باغ کی دیوار دیکھنا
گر زمزمہ یہی ہے کوئی دن تو ہم صفیر — اس فصل ہی میں ہم کو گرفتار دیکھنا

زمیں اک صفحۂ تصویر بیہوشاں سے مانا ہے — یہ مجلس جب سے ہے اچھا نہیں کچھ رنگ صحبت کا
جہاں جلوے سے اُس محبوب کے یکسر لبالب ہے — نظر پیدا کر اول پھر تماشا دیکھ قدرت کا
خرابی دل کی اس حد ہے کہ یہ سمجھا نہیں جاتا — کہ آبادی بھی یاں تھی یا کہ ویرانہ تھا مدت کا
نگاہِ مست نے اُس کی لٹائی خانقہ ساری — پڑا ہے برہم اب تک کارخانہ زہد و طاعت کا

جو اس شور سے میر روتا رہے گا | تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا
میں وہ رونے والا جہاں سے چلا ہوں | جسے ابر ہر سال روتا رہے گا
مجھے کام رونے سے اکثر ہے ناصح | تو کب تک مرے منہ کو دھوتا رہے گا
بس اے گریہ آنکھیں تری کیا نہیں ہیں | جہاں کو کہاں تک ڈبوتا رہے گا
مرے دل نے وہ نالہ پیدا کیا ہے | جرس کا بھی جو ہوش کھوتا رہے گا
تو یوں گالیاں غیر کو شوق سے دے | ہمیں کچھ کہے گا تو ہوتا رہے گا
بس اے میر مژگاں سے پونچھ آنسوؤں کو | تو کب تک یہ موتی پروتا رہے گا

دل عشق کا ہمیشہ حریف نبرد تھا | اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں آگے درد تھا

قطعہ

یاں بلبل اور گل پہ تو عبرت سے آنکھ کھول | گل گشت سرسری نہیں اس گلستاں کا
گل یادگار چہرۂ خوباں ہے بے خبر | مرغ چمن نشاں ہے کسو خوش زباں کا

شیخ کیا صورتیں رہتی تھیں بھلا جب تھا دیر | رد ویرانی ہو اس کعبے کی آبادی کا
ریختہ رتبے کو پہنچایا ہوا ہے اس کا | معتقد کون نہیں میر کی استادی کا

سعی طوف حرم نہ کی ہرگز | آستاں پر ترے مقام کیا
تیرے کوچے کے رہنے والوں نے | یہیں سے کعبے کو سلام کیا
عشق خوباں کو میر میں اپنا | قبلہ و کعبہ و امام کیا

طالع جو خوب تھے نہ ہوا حاہ کچھ نصیب
سر پر مرے کرور برس تک ہما پھرا
دیر و حرم میں کیونکہ قدم رکھ سکے گا میر
ادھر تو اس سے بت پھرے ادھر خدا پھرا

خدا کو کام تو سونپے ہیں میں نے سب لیکن
رہے ہے خوف مجھے واں کی بے نیازی کا
سو کی بات نے آگے مرے نہ پایا رنگ
دلوں میں نقش ہے میری سخن طرازی کا
بساں خاک ہو پامال راہِ خلق اے میر
رکھے ہے دل میں اگر قصد سرفرازی کا

بزمِ عشرت میں بلا مت ہم نگوں بختوں کو میر
جوں حبابِ بادہ ساغر سرنگوں ہو جائینگا

کیا کہئے کہ خوباں نے اب ہم میں ہے کیا رکھا
اُن چشم سیاہوں نے بہتوں کو سلا رکھا
جلوہ ہے اُسی کا سب گلشن میں زمانے کے
گل پھول کو ہے اُن نے پروانہ بنا رکھا
جوں برگِ خزاں دیدہ سب زرد ہوے ہم تو
گرمی نے ہمیں دل کی آخر کو جلا رکھا

پوشیدہ رازِ عشق چلا جائے تھا سو آج
بے طاقتی نے دل کی وہ پردہ اُٹھا دیا
اس موجِ خیز دہر میں ہم کو قضا نے آہ
پانی کے بلبلے کی طرح سے مٹا دیا
سب شور ما و من کو لئے سر میں مر گئے
یاروں کو اس فنا نے نے آخر سلا دیا
آوارگانِ عشق کا پوچھا جو میں نشاں
مشتِ غبار لے کے صبا نے اڑا دیا
تکلیف درد دل کی عبث ہم نشیں نے کی
دردِ سخن نے میرے سبھوں کو رلا دیا

وصیت میر نے مجھ کو یہی کی
کہ سب کچھ ہونا تو عاشق نہ ہونا

کیا بعد مرگ یاد کروں گا وفا تجھے
ستا رہا جفائیں میں جب تک جیا کیا

لذت سے نہیں خالی جانوں کا کھپا جانا
کب خضر و مسیحا نے مرنے کا مزا جانا

تھا ناز بہت ہم کو دانست پر اپنی بھی
آخر وہ بُرا نکلا ہم جس کو بھلا جانا

کیا پانی کے مول آ کر مالک نے گہر بیچا
ہے سخت گراں سستا یوسف کا بکا جانا

اے شور قیامت ہم سوتے ہی نہ رہ جاویں
اس راہ سے نکلے تو ہم کو بھی جگا جانا

عالم کی سیر میر کی صحبت میں ہو گئی
طالع سے میرے ہاتھ یہ بیدست و پا لگا

حق تو سب کچھ ہی ہے تو ناحق نہ بول
بات کہتے سر کٹا منصور کا

بیچ سے کب کا گیا اب ذکر کیا
اس دلِ مرحوم کا مغفور کا

قطعہ

مر گئے پر خاک ہے سب کبر و ناز
مت جھکو گو سر کسو مغرور کا

ٹھیکری کو قدر ہے اس کو نہیں
ٹوٹے جب کاسہ سر فغفور کا

یہ بھی طرفہ ماجرا ہے کہ اسی کو چاہتا ہوں
مجھے چاہیئے ہے جس سے بہت احتراز کرنا

جس شعر پہ سماع تھا کل خانقاہ میں
وہ آج میں سنا تو ہے میرا کہا ہوا

پھٹتا ہے زندگی کے لئے آہ خوار کیا
اس وہم کی نمود کا ہے اعتبار کیا

صحبت رہی بگڑتی ہے اس کینہ ور سے آہ — ہم جانتے نہیں ہیں کہ ہوتا ہے پیار کیا

حیرت روئے گل سے مرغ چمن — چپ ہے یوں بے زبان ہے گویا
مسجد ایسی بھری بھری کیا ہے — میکدہ اک جہان ہے گویا
وہی شور مزاج شیب میں ہے — میر اب تک جوان ہے گویا

ہوش اڑ گئے سبھوں کے شور سحر سے اسکے — مرغ چمن اگرچہ یک مشت بال و پر تھا
پھر آج یہ کہانی کل شب پہ رہگئی ہے — سوتا نہ رہتا تک تو قصہ ہی مختصر تھا

اک نگہ ایک چشمک ایک سخن — اس میں بھی تم کو ہے تامل سا
یار دستوں نے ہوشیاری کی — دے کے کچھ محتسب کا منہ جھلسا

عشق نے کیا کیا تصرف یاں کئے ہیں آجکل — چشم کو پانی کیا سب دل کو سب لوہو کیا
کیا ہیں قدرت کے کچھ بولا نہیں جاتا ہے ہائے — خوبرو اس کو کیا لیکن بہت بدخو کیا

میر ستم کشتہ کسو وقت جواں تھا — انداز سخن کا سبب شور و فغاں تھا
جادو کی پڑی پرچۂ ابیات تھا اس کا — منہ تکئے غزل پڑھتے عجب سحر بیاں تھا
جس راہ سے وہ دل زدہ دلی میں نکلتا — ساتھ اسکے قیامت کا سا ہنگامہ رواں تھا
افسردہ نہ تھا ایسا کہ جوں آب زدہ خاک — آندھی تھا بلا تھا کوئی آشوب جہاں تھا
غافل تھے ہم احوال دل خستہ سے اپنے — وہ گنج اسی کنج خرابہ میں نہاں تھا
تو میر جہاں میں کنہوں [illegible] — [illegible] تو کہاں نام و نشاں تھا

دل نہ تھا ایسی جگہ جسکی نہ سُدھ لیجے کبھو — اجڑی اِس بستی کو پھر تو نے بسایا ہوتا
دل سے خوش طرح مکاں پھر بھی کہیں بنتے ہیں — اس عمارت کو تو ٹک دیکھ کے ڈھایا ہوتا

بے خودی لے گئی کہاں ہم کو — دیر سے انتظار ہے اپنا
روتے پھرتے ہیں ساری ساری رات — اب یہی روزگار ہے اپنا
دے کے دل ہم جو ہو گئے مجبور — اس میں کیا اختیار ہے اپنا
کچھ نہیں ہم مثالِ عنقا لیک — شہر شہر اشتہار ہے اپنا
جس کو تم آسمان کہتے ہو — سو دلوں کا غبار ہے اپنا

کجی اُس کی جو میں جتانے لگا — مجھے سیدھیاں وہ سنانے لگا
تحمل نہ تھا جس کو ٹک سو وہ میں — ستم کیسے کیسے اٹھانے لگا
پریشاں ہیں اسوقت میں نیک و بد — مُوا جو کوئی وہ ٹھکانے لگا
نہیں رہتے عاقل علاقے بغیر — کہیں میر دل کو دوانے لگا

کچھ عشق و ہوس میں فرق بھی کر — کیدھر ہے وہ امتیاز تیرا
کہتے نہ تھے میر مت کُڑھا کر — دل ہو نہ گیا گداز تیرا

آنسو مری آنکھوں میں ہر دم جو نہ آ جاتا — تو کام مرا اچھا پردے میں چلا جاتا
کہتے تو ہو یوں کہتے یوں کہتے جو وہ آتا — یہ کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا
گر عشق نہیں ہے تو یہ کیا ہے بھلا مجھ کو — جی خود بخود اے ہمدم کاہے کو کھپا جاتا

کوئی سادہ ہی اس کو سادہ کہے — لگے ہے ہمیں تو وہ عیار سا
محبت ہے یا کوئی جی کا ہے روگ — سدا میں تو رہتا ہوں بیمار سا
مگر آنکھیں تیری بھی چپکی ہیں — ٹپکتا ہے چتون سے کچھ پیار سا

وائے احوال اُس جفاکش کا — عاشق اپنا جسے وہ جان گیا
داغ حرماں ہے خاک میں بھی ساتھ — جی گیا پہ نہ یہ نشان گیا
کل نہ آنے میں ایک یاں تیرے — آج سو سو طرف گمان گیا
دل سے مت جا کہ پھر وہ پچھتایا — ہاتھ سے جس کے یہ مکان گیا
کون جی سے نہ جائیگا اے میر — حیف یہ ہے کہ تو جوان گیا

کل میں کہا وہ طور کا شعلہ کہاں گرا — دل نے جگر کی اور اشارت کی یاں گرا
کیا کم تھا شعلہ شوق کا شعلے سے طور کے — پتھر بھی واں کے جل گئے جا کر جہاں گرا

آتے ہی آتے تیرے یہ ناکام ہو چکا — واں کام ہی رہا تجھے یاں کام ہو چکا
تڑپے ہے جبکہ سینے میں اچھلے ہے دو دو ہاتھ — گر دل یہی ہے میر تو آرام ہو چکا

عجب ہم بے بصیرت ہیں کہاں کھولا ہے بار آکر — یہاں سے لوگ سب رختِ سفر کرتے ہیں بار اپنا
نہ ہو یوں میکدہ مسجد پہ واں ہوش جاتے ہیں — ہوا ہے دونوں جاگہ ایک دو باری گزارا اپنا
سراپا آرزو ہم لوگ ہیں ناحق کو زندوں میں — رہے ہیں اب تلک جیتے ولے دل مار مارا اپنا

میر بھی دیر کے لوگوں ہی کی سی کہنے لگا — کچھ خدا لگتی بھی کہتا جو مسلماں ہوتا

پہلا قدم ہے انساں پامالِ مرگ ہونا — کیا جانیے رفتہ رفتہ کیا ہو مآل تیرا
کچھ زرد زرد چہرہ کچھ لاغری بدن میں — کیا عشق میں ہوا ہے اے میرؔ حال تیرا

مجھکو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب میں نے — درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

پریشاں ہوا دوستی کر کے میں تو — بہت مجھکو ارمان تھا چاہ کا
اسیری کا دیتا ہے مژدہ مجھے — مرا زمزمہ گاہ و بیگاہ کا

چشم سے خوں ہزار نکلے گا — کوئی دل کا بخار نکلے گا

صاحب ہو مار ڈالو مجھے تم وگرنہ کچھ — جز عاشقی گناہ نہیں ہے غلام کا

ہر آن تھی سرگوشی یا بات نہیں گاہے — اوقات ہے اک یہ بھی اک وہ بھی زمانہ تھا
پامالی عزیزوں کی رکھتی تھی نظر میں ٹک — آتا کبھی یہیں آکر یاں سر نہ اٹھاتا تھا
اک مجھ تماشا ہیں اک گرم ہیں قصے کے — یاں آج جو کچھ دیکھا سو کل وہ فسانا تھا
کیا موتیں ہیں ناگاہی مشتاقوں کی ہجراں میں — اس پیکر کو اے خالق ایسا نہ بنانا تھا
مت سہل ہمیں سمجھو پہنچے تھے بہم تب ہم — برسوں تئیں گردوں نے جب خاک کو چھانا تھا

دل جی کے الجھنے ہی کے جھگڑے ہیں سب یہ — رات اسکے خیالات سے رہتے ہیں قضایا

تحقیق کروں کس سے حقیقت کے نشے کو / خضر آب اسے کہتا ہے آتش کے ہو سا

دل سے کیا کیا نہ درد رات دیے / جیسے پکتا رہے کوئی پھوڑا
کیا کرے سخت مدعی تھے بلند / کوہکن تو نے سر بہت پھوڑا
دل ہی مرغِ چمن کا ٹوٹ گیا / پھول گلچیں نے ہائے کیوں توڑا
ہے لبِ بام آفتابِ عمر / کریے سو کیا ہے میر دن تھوڑا

ابر اور جوشِ گل ہے چل خانقہ سے صوفی / ہے لطف میکدے میں دہ چند اس ہوا کا

کیونکر بسر کرے غم و غصے میں ہجر کے / خوگر ہو جو کسو کے کوئی التفات کا
واعظ کہے سو سچ ہے ولے مے فروش سے / ہم ذکر بھی سنا نہیں صوم و صلوٰت کا
عالم کسو حکیم کا باندھا طلسم ہے / کچھ ہو تو اعتبار بھی ہو کائنات کا

تجاہل تغافل تساہل کیا / ہوا کام مشکل توکّل کیا
نہیں تاب لاتا دلِ زار اب / بہت ہم نے صبر و تحمّل کیا
زمینِ غزل ملک سے ہو گئی / یہ قطعہ تصرف میں بالکل کیا
حقیقت نہ میر اپنی سمجھی گئی / شب و روز ہم نے تامّل کیا

رفتۂ عشق کیا ہوں میں اب کا / جا چکا ہوں جہان سے کب کا
لوگ جب ذکرِ یار کرتے ہیں / دیکھ رہتا ہوں میں منہ سب کا
مست رہتا ہوں جب سے ہوش آیا / میں بھی عاشق ہوں اپنے مشرب کا

دیکھا نہ ادھر ورنہ آتا نہ نظر پھر میں
جی مفت مرا جاتا اُس شوخ کا کیا جاتا
تھا میر بھی دیوانہ پر ساتھ ظرافت کے
ہم سلسلہ داروں کی زنجیر ہلا جاتا

دل کو گل کہتے تھے درد و غم سے مرجھا گیا
جی کو مہماں سنتے تھے مہمان سا آیا گیا
جستجو میں یہ تعب کھینچی کہ آخر ہو گئے
ہم تو کھوئے بھی گئے لیکن نہ کچھ پایا گیا

مکے گیا مدینے گیا کربلا گیا
جیسا گیا تھا ویسا ہی چل پھر کے آگیا
دیکھا ہو کچھ اس آمد و شد میں تو میں کہوں
خود گم ہوا ہوں بات کی تہ آپ پا گیا

خوب کیا جو اہل کرم کے جُود کا کچھ نہ خیال کیا
ہم جو فقیر ہوئے تو ہم نے پہلے ترک سوال کیا

بہار آئی چلو چمن میں ہوا کے اوپر بھی رنگ آیا
کہاں تلک گل نہ ہووے غنچہ رہا نہ دے منہ سو تنگ آیا
چھبیلے ہیں موڈھے بیٹھی ہے کہنی چپسے ہے چولی پھنسے ہے جھری
قیامت اس کی ہے تنگ پوشی بہار اجی تو پتنگ آیا
وہی ہے رونا وہی ہے کڑھنا وہی ہے شورش جوانی کی سی
بڑھاپا آیا ہے عشق ہی میں پہ میر ہم کو نہ ڈھنگ آیا

لنے ہم سے کچھ نہ اُس ستم ایجاد سے ہوا
ظلم صریح عشق کی امداد سے ہوا

دور بہت بھاگو ہو ہم سے سیکھے طریق غزالوں کا
وحشت کرنا شیوہ ہے کچھ اچھی آنکھوں والوں کا

منہ اپنا کبھو وُہ ادِھر کر رہے گا ۔ ہمیں عشق ہے تو اثر کر رہے گا
جو دلبر ہے ایسا تو دل جا چکا ہے ۔ کسو روز آنکھوں میں گھر کر رہے گا
ہر اک کام موقوف ہے وقت پر ہی ۔ دلِ خوں شدہ بھی جگر کر رہے گا

سخن مشتاق ہے عالم ہمارا ۔ غنیمت ہے جہاں میں دم ہمارا
رکھے رہتے ہیں دل پر ہاتھ اے میرؔ ۔ یہیں شاید کہ سب ہے غم ہمارا

ہر ورق ہر صفحے میں اک شعر شور انگیز ہے ۔ عرصۂ محشر کا عرصہ ہے مرے دیوان کا

عشق ہمارے خیال پڑا ہے خواب گئی آرام گیا ۔ جی کا جانا ٹھیر رہا ہے صبح گیا یا شام گیا
عشق گیا سر دین گیا ایمان گیا اسلام گیا ۔ دل نے ایسا کام کیا کچھ جس سے میں ناکام گیا
ہائے جوانی کیا کیا کہئے شور سروں میں رکھتے تھے ۔ اب کیا ہے وُہ عہد گیا وہ موسم وُہ ہنگام گیا

وصل میں رنگ اڑ گیا میرا ۔ کیا جدائی کو منہ دکھاؤں گا

بعد ہمارے اِس فن کا جو کوئی ماہر ہووے گا ۔ دردآگیں انداز کی باتیں اکثر پڑھ پڑھ رووے گا
چشم تماشا وا ہووے تو دیکھا بھالی غنیمت ہے ۔ مت موندے آنکھوں کو غافل دیر تلک پھر سووے گا
جب وہ جو کبھی مسکی کریئے جس کا نشاں کچھ پیدا ہو ۔ پانا اس کا میرؔ ہے مشکل جی تو یونہیں کھووے گا

جب زمزمہ کرتی ہے صد اچھیں ہے دل میں ۔ بلبل سے کوئی سیکھ لے انداز سخن کا

اُسکی سی جو چلے ہے راہ تو کیا
آسمان پر گیا ہے ماہ تو کیا

کب رُخِ بدر روشن ایسا ہے
ایک شب کا ہے اشتباہ تو کیا

بے خرد خانقہ میں ہیں گو مست
وُہ کرے مست اِک نگاہ تو کیا

حسن والے ہیں کج روش سارے
ہُوے دو چار رو براہ تو کیا

سر مارنا پتھر سے یا ٹکڑے جگر کرنا
اِس عشق کی وادی میں ہر نوع بسر کرنا

دِل کے خوں ہونے کا غم کیا اب سے تھا
سینہ کو بی سخت ماتم کب سے تھا

فلک نے پھیر کر سرمہ بنایا
نظر میں اُس کی میں تو بھی نہ آیا

زمانے میں مرے شورِ جنوں نے
قیامت کا سا ہنگامہ اُٹھایا

قریبِ دیر خضر آیا تھا لیکن
ہمیں رستہ نہ کعبے کا بتایا

حق صحبت نہ طیروں کو رہا یاد
کوئی دو پھول اسیروں تک نہ لایا

موئے ہم جسکی خاطر بے وفا تھا
نہ جانا اُن نے تو یوں بھی کہ کیا تھا

معالج کی نہیں تقصیر ہرگز
مرض ہی عاشقی کا لادوا تھا

نہ ملیو چاہنے والوں سے اپنے
نہ جانے تجھ سے یہ کن نے کہا تھا

پریشاں کر گئی فریاد بلبل
کسو سے دل ہمارا پھر لگا تھا

ملے پرسوں وہی بے گانگی تھی
ہمارے زعم میں وُہ آشنا تھا

نہ دیوانے تھے ہم سے قیس و فرہاد
ہمارا طور عشق اِن سے جدا تھا

صنم خانے سے اٹھ کعبے گئے ہم
کوئی آخر ہمارا بھی خدا تھا

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں ایسی نہ سنئے گا
پڑھتے کسو کو سنئے گا تو دیر تلک سر دھنئے گا
سعی و تلاش بہت سی رہیگی اس انداز کے کہنے کی
صحبت میں علما فضلا کی جا کر پڑھئے گنئے گا

سائے میں تاک کے مجھے رکھا اسیر کر
صیاد کے کرم سے قفس آشیاں ہوا
ہم نے نہ دیکھا اس کو سو نقصان جاں کیا
ان نے جو اک نگاہ کی اس کا زیاں ہوا
وے تو کھڑے کھڑے مرے گھر آ کے پھر گئے
میں بے دیار و بے دل و بے خانماں ہوا

جو تو ہی صنم ہم سے بیزار ہو گا
تو جینا ہمیں اپنا دشوار ہو گا
غم ہجر رکھے گا بیتاب دل کو
ہمیں کڑھتے کڑھتے کچھ آزار ہو گا
جو افراط الفت ہے ایسا تو عاشق
کوئی دن میں برسوں کا بیمار ہو گا
اچٹتی ملاقات کب تک رہے گی
کبھو تو تہ دل سے بھی یار ہو گا
تجھے دیکھ کر لگ گیا دل نجانا
کہ اس سنگدل سے ہمیں پیار ہو گا
یہی ہو گا کیا ہو گا میر ہی نہ ہونگے
جو تو ہو گا بے یار و غم خوار ہو گا

رہے بدحال صوفی حال کرتے در مجلس میں
مغنی سے سنا مصرع جو میر شعر حالی کا
نظر بھر دیکھتا کوئی تو تم آنکھیں چھپا لیتے
سماں سب یاد ہو گا کب تمہیں وہ خود سالی کا
چمک یاقوت کی چلتی ہے اتنی دور کا ہیکو
اچنبھا ہے نظر بازوں کو ان ہونٹوں کی لالی کا
دماغ اپنا تو اپنی فکر ہی میں ہو چکا یکسر
خیال اب کس کو ہے اے ہمنشیں نازک خیالی کا

سخن مشتاق ہے عالم ہمارا
بہت عالم کرے گا غم ہمارا
پڑھیں گے شعر رو رو لوگ بیٹھے
رہے گا دیر تک ماتم ہمارا

نہیں ہے مرجع آدم اگر خاک — کدھر جاتا ہے قدِّ خم ہمارا
زمین و آسماں زیر و زبر ہے — نہیں کم حشر سے اودھم ہمارا
کسو کے بال درہم دیکھتے میرؔ — ہُوا ہے کام دل برہم ہمارا

جانا نہ تھا سرہانے مجھ مختصر کے ہائے — کیا وقت رہ گیا تھا کہ وہ منہ چھپا گیا
آشفتہ سر ہیں سرو گریباں دریدہ گل — بیٹھا کہاں چمن میں کہ فتنہ اُٹھا گیا
گلبرگ سے بھرے تھے کبھی تو کنار و جیب — کیا کیا سمیں نہ گریۂ خونیں دکھا گیا
خط بھیج کے بھی شوق کی باتیں چلی گئیں — قاصد کے پیچھے دُور تلک میں لگا گیا
روتا ہُوں یُوں کہ برسے ہے شدت سے جیسے مینہ — جوں ابر میرے دل پہ غمِ عشق چھا گیا
ہستی مری کہ ہیچ تھی میں منفعل رہا — اِس شرم سے ندان زمیں میں سما گیا

داغِ دلِ خراب شبوں کو جلے ہے میرؔ
عشق اس خرابے میں بھی چراغ اک جلا گیا

شب کو وہ پیئے شراب نکلا — جانا یہ کہ آفتاب نکلا
قربانِ پیالۂ مئے ناب — جس سے کہ ترا حجاب نکلا
مجھ بن جو پیا تھا قطرہ مے کا — آنکھوں سے ہو خونِ ناب نکلا
مستی میں شراب کی جو دیکھا — عالم یہ تمام خواب نکلا
شیخ آتے تو میکدے میں آیا — پر ہو کے بہت خراب نکلا
یک جرعہ شراب ہی میں واعظ — ہر مسخرگی کا باب نکلا
تھا غیرتِ بادہ عکسِ گل سے — جس جُوے چمن سے آب نکلا

ردیف ب

شکوہ عبث ہے میرؔ کہ کڑھتے ہیں سارے دن
یا دل کا حال رہتا ہے درہم تمام شب

گزرا کسے جہاں میں خوشی سے تمام روز
کس کی کٹی زمانے میں بے غم تمام شب

مت ڈھلک مژگاں سے اب تو اے سرشکِ بیدار
مفت میں جاتی رہیگی تیری موتی کی سی آب

کچھ نہیں بحرِ جہاں کی موج پر مت بھول میرؔ
دور سے دریا نظر آتا ہے لیکن ہے سراب

زردی رنگ ہے غم پوشیدہ پر دلیل
دل میں جو کچھ ہے منہ سے ہمارے عیاں ہے اب

برسوں ہوئے گئے اُسے پر بھولتا نہیں
یادش بخیر میرؔ رہے خوش جہاں ہے اب

طاقت کہ جس سے تاب جفا تھی سو ہو چکی
تھوڑی سی کوفت میں بھی بہت سا تعب ہے اب

لے جاہ وہ اسے ہے نہ مجھ کو ہے وہ دماغ
جانا مرا اُدھر کو بشرط طلب ہے اب

ناسازئ طبیعت ایسی کہ اُس کے اُوپر
ہے ہر کسو سے مجھ کو ناچار سازواجب

اِس عمرِ برق جلوہ کی فرصت بہت ہے کم
جو کام پیش آوے تجھے اِس میں ہو شتاب

غفلت سے یہ غرور تجھے ورنہ ہے بھی کچھ
یاں وہ سماں ہے جیسے کہ دیکھے ہے کوئی خواب

یہ بستیاں اُجڑ کے کہیں بستیاں بھی ہیں
دِل ہو گیا خراب جہاں پھر رہا خراب

کاش اُسکے روبرو نہ کریں مجھ کو حشر میں
کتنے مرے سوال ہیں جن کا نہیں جواب

مسکن جہاں تھا دلِ زدہ مسکیں کا ہم تو واں ‌ ‌ کل دیر میرؔ میر پکارے نہیں ہے اب

دُنیا میں حُسن و خُوبی میرؔ اک عجیب شے ہے ‌ ‌ زندان و پارسایاں جس پر رکھیں نظر سب

یارب کدھر گئے وے جو آدمی روش تھے ‌ ‌ اوجڑ دکھائی دے ہیں شہر و دہ و نگر سب
حرف و سخن سے مُطلق یاں گفتگو نہیں ہے ‌ ‌ پیادے سوار ہم کو آئے نظر نفر سب
عالم کے لوگوں کا ہے تصویر کا سا عالم ‌ ‌ ظاہر کھلی ہیں آنکھیں لیکن ہیں بیخبر سب
میرؔ اس خرابی میں کیا آباد ہووے کوئی ‌ ‌ دیوار و در گرے ہیں ویراں پڑے ہیں گھر سب

شبہائے تار و تیرہ زمانے میں دن ہُوئے ‌ ‌ شب ہجر کی بھی ہووے سحر تو ہے کیا عجب
جائے ہے چشم شوخ کسو کی ہزار جا ‌ ‌ آوے ادھر بھی اُسکی نظر تو ہے کیا عجب

آیا ہے شیب سر پہ گیا ہے شباب اب ‌ ‌ کرنا جو کچھ ہو تم کو سو کر لو شتاب اب
بگڑا اپنا ہوں عشق سے سو بار عاقبت ‌ ‌ پایا قرار یہ کہ رہوں میں خراب اب
خونریزی عاشقوں کی ہے ظالم اگر ثواب ‌ ‌ تو تو ہوا ہے تجھ کو بہت سا ثواب اب

ردیف ت

ہر جنس کے خواہاں ملے بازارِ جہاں میں ‌ ‌ لیکن نہ ملا کوئی خریدارِ محبت
اِس راز کو رکھ جی ہی میں تا جی بچے تیرا ‌ ‌ زنہار جو کرتا ہو تو اظہارِ محبت

اب تو چپ لگ گئی ہے حسرت سے
پھر کھلے گی زبان جب کی بات

نکتہ دانانِ رفتہ کی نہ کہو
بات وہ ہے جو ہووے اب کی بات

کس کا روئے سخن نہیں اودھر
ہے نظر میں ہماری سب کی بات

ظلم ہے قہر ہے قیامت ہے
غصے میں اُسکے زیرلب کی بات

کہتے ہیں آگے تھا بتوں میں رحم
ہے خدا جانئے یہ کب کی بات

گو کہ آتش زباں تھے آگے میر
اب کی کہئے گئی وہ تب کی بات

دیر کچھ کھینچتی تو کہتے بھی ملاقات کی بات
ملنا جو اپنا ہو اُس سے سو وہ ہو باتکی بات

گفتگو شاہدِ دمے سے ہے نہ غیبت نہ گلہ
خالقہ کی سی نہیں بات خرابات کی بات

ہوتی ہے گرچہ کہنے سے یار و پرائی بات
پر ہم سے تو تھمی نہ کبھو مُنہ پر آئی بات

کہتے تھے اِس سے ملئے تو کیا کیا نہ کہئے لیک
وہ آگیا تو سامنے اُس کے نہ آئی بات

اب تو ہوئے ہیں ہم بھی ترے ڈھب سے آشنا
واں تو نے کچھ کہا کہ ادھر ہم نے پائی بات

بلبل کے بولنے میں سب انداز ہیں مرے
پوشیدہ کب رہی ہے کسو کی اڑائی بات

عالم سیاہ خانہ ہے کس کا کہ روز و شب
یہ شور ہے کہ دیتی نہیں کچھ سنائی بات

اِک دن کہا تھا یہ کہ خموشی میں ہے وقار
سو مجھ سے ہی سخن نہیں میں جو بتائی بات

اب مجھ ضعیف و زار کو مت کچھ کہا کرو
جاتی نہیں ہے مجھ سے کسو کی اٹھائی بات

ملامت گر نہ مجھ کو کر ملامت
جلے کو اور تو اتنا جلامت

تری نا آشنائی کے ہیں بندے
نہ وہ اب ربط لے صاحب سلامت

بہت رونے نے رسوا کر دکھایا
نہ چاہت کی چھپی ہم سے علامت

شعر کے پردے میں میں نے غم سنایا ہے بہت
مرثیئے نے دل کے میرے بھی رلایا ہے بہت

وادی و کہسار میں روتا ہوں ڈاڑھیں مار مار
دلبرانِ شہر نے مجھ کو ستایا ہے بہت

واہمیں ہوتا کسی سے دل گرفتہ عشق کا
ظاہرا غمگیں اُسے رہنا خوش آیا ہے بہت

مت اِن نمازیوں کو خانہ ساز دیں جانو
کہ ایک اینٹ کی خاطر یہ ڈھاتے ہیں گے مسجد

غمِ زمانہ سے فارغ نہیں مایہ باختگاں
قمار خانۂ آفاق میں ہے ہار ہی جیت

مجھ بینوا کی یاد ہے میر یہ صدا
اس میکدے میں رہیو بہت ہوشیار دوست

پھول گل شمس و قمر سارے ہی تھے
پر ہمیں اِن میں تمہیں بھائے بہت

میر سے پوچھا جو میں عاشق ہو تم
ہو کے کچھ چپکے سے شرمائے بہت

کوشش اپنی بھی عبث پر کی بہت
کیا کریں ہم چاہتا تھا جی بہت

ہمیں عشق میں میر جب لگ گئی ہے
نہ شکر و شکایت نہ حرف و حکایت

چشم رہنے لگی پُر آب بہت
شاید آوے گا خونِ ناب بہت

دیر و کعبے میں اُس کے خواہشمند
ہوتے پھرتے ہیں ہم خراب بہت

دل کے دل ہی میں رہ گئے ارماں
کم رہا موسمِ شباب بہت

مارنا عاشقوں کا گر ہے ثواب
تو ہوا ہے تمہیں ثواب بہت

تھی بحر کی سی لہر کہ آئی چلی گئی   پہنچی ہے اس سرے تئیں طبع روانی کی بات
اب تو وفا و مہر کا مذکور ہی نہیں   تم کس سمیں کی کہتے ہو ہے یہ کہانی کی بات

منہ پہ رکھتا ہے وہ نقاب بہت   ہم سے کرتا ہے وہ حجاب بہت
چشمکِ گل کا لطف کبھی نہ اٹھا   کم رہا موسمِ شباب بہت
ڈھونڈتے اس کو چپے کوچے پھرے   دل نے ہم کو کیا خراب بہت
چلنا اپنا قریب ہے شاید   جاں کرے ہے اب اضطراب بہت
اس عقیلے سے کیا کسو کی نبھے   مہربانی ہے کم عتاب بہت

کب آویگا کیا جانے وہ سرو قامت   ہمارے تو سر پر ابھی ہے قیامت
نمازِ سفر ہے اشارت اسی سے   کہ تھوڑا بہت یاں ہے وقت اقامت
رہا رابطہ غارتِ دل تلک بس   نہیں اب تو بندے سے صاحب سلامت
گریباں کو گل چاک کرنے لگیں گے   کھلے رکھ گلستاں میں بندِ قیامت
اٹھا کر نہ یک زخم شمشیر اس کا   غزالِ حرم نے اٹھائی ملامت
بگڑتی ہے صورت علاقے سے دل کے   کسو بے وفا سے دل اپنا لگا مت
کوئی فصلِ گل میں بھی توبہ کرے ہے   رہے گی ہمیں دیر اس کی ندامت
کہیں دل کی لاگیں لگیں چھپتیاں ہیں   کہ چہرے کی زردی بڑی ہے علامت
گئے سو گئے بیشتر تھی جوانی   رہِ عشق میں میر آئندہ جا مت

یاد آیا ہے کہ ہنگامہ رہا کرتا تھا رات   شور و شر سے میرے اک فتنہ رہا کرتا تھا رات
کام کیا تھا جیب و دامن سے مجھے پیش از جنوں   سینہ چاکی اپنی میں بیٹھا کیا کرتا تھا رات

جن دنوں کھنچا تھا سر اُس بادشاہِ حُسن نے — ہر گلی میں اک فقیر اُسکی دعا کرتا تھا رات
اب جہاں کچھ بات چھیڑی سوچ لایا پیش ذہن — میں کہا کرتا غمِ دل وُہ سنا کرتا تھا رات
ہجر میں کیا کیا ہمیں دیکھے ہیں ان آنکھوں نے میں — زرد رُخ پر لالہ گوں آنسو بہا کرتا تھا رات

ردیف ج

ساقی ٹک ایک موسمِ گُل کی طرف بھی دیکھ — ٹپکا پڑے ہے رنگِ چمن میں ہوا سے آج
شیشہ صراحی ساغر مینا سب کل تک بھی حاضر تھے — کوئے بادہ فروشاں بیچ میری حُرمت کیا ہے آج

ردیف چ

عشق میں اے طبیب ہاں ٹک سوچ — پائے جاں درمیاں ہے یاں ٹک سوچ
سرسری مت جہاں سے جا غافل — باؤں تیر اڑے جہاں ٹک سوچ
پھیل اتنا پڑا ہے کیوں تو یاں — یار اگلے گئے کہاں ٹک سوچ
ہونٹ اپنا ہلا نہ سمجھے بن — یعنے جب کھولے تو زباں ٹک سوچ
گُل و رنگ و بہار پردے ہیں — ہر عیاں میں ہے وُہ نہاں ٹک سوچ

فائدہ سر جھکے کا شیب میں میر
پیری سے آگے اے جواں ٹک سوچ

ایک ہوویں جو زبانِ دل تو کچھ نکلے بھی کام ... [illegible]

ے بوئے گل سمجھ کے تھکیوپوں کے بیچ　زخمی پڑے ہیں مُرغ ہزاروں چمن کے بیچ

منتظر برسوں رہے افسوس آخر مرگئے　دیدنی تھے لوگ اس ظالم کے بیمارونکے بیچ

دل یہی ہے جسکو دل کہتے ہیں اِس عالم کے بیچ　کاش یہ آفت نہ ہوتی قالب آدم کے بیچ
رونقِ آبادیٔ مُلکِ سخن ہے اُس تلک　ہوں ہزاروں دم الٰہی میر کے اکدم کے بیچ

ردیف ح

جوں سبزہ چل چمن میں لبِ جُو پہ سیر کر　عمرِ عزیز جاتی ہے آبِ رواں کی طرح
جو سقفِ بے عمد ہو نہیں اس کا اعتماد　کِس خانماں خرابنے کی آسماں کی طرح

یُوسف کی اِس نظیر سے دلکو نہ جمع رکھ　ایسی متاع جاتی ہے بازار ہر طرح

ردیف د

میرے سنگِ مزار پر فرہاد　رکھ کے تیشہ کہے ہے یا اُستاد

ظلم سہتے ہیں [illegible]
زندگانی کی کچھ بھی ہے بنیاد

خاک بھی سر پہ ڈالنے کو نہیں
کس خرابے میں ہم ہوئے آباد

سنتے ہو ٹک سنو کہ پھر مجھ بعد
نہ سنو گے یہ نالہ و فریاد

ہر طرف ہیں اسیر ہم آواز
باغ ہے گھر ترا تو اے صیاد

ہم کو مرنا یہ ہے کہ کب ہوں کہیں
اپنی قید حیات سے آزاد

ہمیں اسیر کو ہونا ہے اپنا اچھا یاد
کشش نہ دام کی دیکھے نہ کوشش صیاد

نہ دردمندی سے یہ راہ تم چلے ورنہ
قدم قدم پہ تھی یاں جائے نالہ و فریاد

ثبات قصر و در و بام و خشت و گل کتنا
عمارت دل درویش کی رکھو بنیاد

چمن میں یار ہمیں لے گئے تھے وا نہ ہوئے
ہمارے ساتھ ہی غم بھی دل ناشاد

تن کو جس جاگہ سے چھیڑوں ہوں وہاں ہے دردزد
ہاتھ لگتے دل کے ہو جاتا ہوں کچھ میں زرد زرد

اب تو وہ حسرت سے آہ و نالہ بھی کرنا گیا
کوئی دم ہونٹوں تک آ جاتا ہے گاہے سرد سرد

کم ناز سے ہے کس کے بندے کی بے نیازی
قالب میں خاک کے یاں پنہاں خدا ہے شاید

ہے عشق کا فسانہ میرا نہ یاں زباں زد
ہر شہر میں ہوئی ہے یہ داستاں زباں زد

حسرت سے حسن گل کے چپکا ہوا ہوں ورنہ
طیران باغ میں ہوں میں خوش زبان زباں زد

مذکور عاشقی کا ہر چار سو ہے یا ہم
یعنے نہیں کہانی میری کہاں زباں زد

فرہاد قیس دو احمق ہر ایک سے پوچھ لو تم
مشہور ہوں میں عشق کے ہوں میں ناتواں زباں زد

کیا جانے میر کس کے غم سے ہے چپ وگرنہ
حرف و سخن میں کیا ہی ہے یہ جواں زباں زد

کچھ ہوش نہ تھا منبر و محراب کا ہم کو
صد شکر کہ مسجد میں ہوئے مستی میں وارد

عمرِ عزیز ساری منّت ہی کرتے گزری
بے جُرم آہ رہیے یُوں عذر خواہ تا چند
یاں ناز و سرکشی سے کیا دیکھنا نہیں ہے
کج اِس چمن میں ٹھیرے گُلؔ کی کلاہ تا چند

نہیں خوں بستگی سے چشمِ تر بند
جراحت نے کئے ہیں چشم پر بند
گیا ہے وہ سو دل کھلتا نہیں ہے
پڑا ہے ایک مدت سے یہ گھر بند
گئے دن ٹکٹکی کے باندھنے کے
اب آنکھیں رہتی ہیں دو دو پہر بند

ہمیں منظور ہر صورت میں ہے دید
کھلی ہو چشم جُوں آئینہ یا بند

ردیف ر

قدم دشتِ محبت میں نہ رکھ میرؔ
کہ سر جاتا ہے گامِ اولیں پر

میرؔ صاحب زمانہ نازک ہے
دونوں ہاتھوں سے تھامیے دستار
سہل سی زندگی پہ کام کے تئیں
اپنے اوپر نہ کیجیے دشوار
چار دن کا ہے یہ جھمیلا سب
سب سے رکھیے سلوک ہی ناچار

دلِ جہاں خاک کے برابر ہے
قدرِ ہفت آسمانِ ظلم شعار

درِ مسجد پہ حلقہ زن ہو تم — کہ رہو بیٹھ خانۂ خمّار
جی میں آوے سو کیجیو پیارے — ایک ہو جو نہ درپئے آزار
حاصلِ دو جہان ہے یکحرف — ہو مری جان آگے تم مختار

دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے — پچھتاؤ گے سنو ہو یہ بستی اُجاڑ کر
یارب رہِ طلب میں کوئی کب تلک پھرے — تسکین دے کہ بیٹھ رہوں پانوں گاڑ کر
غالب کہ دیوے قوت دل اس ضعیف کو — تنکے کو جو دکھاوے ہے پل میں پہاڑ کر

جی میں تھا اُس سے ملئے تو کیا کیا نہ کہئیے میرؔ — پر جب ملے تو رہ گئے ناچار دیکھکر

پائے ثبات بھی ہے نام آوری کو لازم — مشہور ہے نگیں جو بیٹھا ہے گھر میں گڑ کر
دیکھو نہ چشم کم سے معمورۂ جہاں کو — بنتا ہے ایک گھریاں سو صورتیں بگڑ کر

شیخ کا اب کمال ہے کچھ اور — حال ہے اور قال ہے کچھ اور
سہل مت بوجھ یہ طلسمِ جہاں — ہر جگہ یاں خیال ہے کچھ اور
نہ ملیں گو کہ ہجر میں مر جائیں — عاشقوں کا وصال ہے کچھ اور
کوزپشتی پہ شیخ کی مت جا — اس پہ بھی احتمال ہے کچھ اور

ہم ضعیفوں کو پائمال نہ کر — دولت و حسن پر نہ ہو مغرور
عرش پر بیٹھتا ہے کہتے ہیں — گر اُٹھے ہے غبارِ خاطرِ مور

شکوۂ آبلہ ابھی سے میرؔ | ہے پیارے ہنوز دلّی دُور

مُشتِ خاک اپنی جو پامال ہے یاں سیہ نہ جا | سر کو کھینچے گا فلک تک یہ غبار آخر کار
چشم وا دیکھ کے اِس باغ میں کیجو نرگس | آنکھوں سے جاتی رہے گی یہ بہار آخر کار
اولِ کار محبت تو بہت سہل ہے میرؔ | جی سے جاتا ہے ولے صبر و قرار آخر کار

مرگ اِک ماندگی کا وقفہ ہے | یعنے آگے چلیں گے دم لے کر

وے لوگ تُم نے ایک ہی شوخی میں کھو دیئے | پیدا کئے تھے چرخ نے جو خاک چھان کر

حاصل بجز کدورت اِس خاکداں سے کیا ہے | خوش وہ کہ اُٹھ گئے ہیں داماں جھٹک جھٹک کر
یہ مشتِ خاک یعنے انسان ہی ہے روکش | ورنہ اُٹھائی کن نے اِس آسماں کی ٹکر
منزل کی میرؔ اُس کی کب راہ تجھ سے نکلے | یاں خضر سے ہزاروں مر مر گئے بھٹک کر

حال کہ چپ رہا تو میں بولا | کس کا قصہ کہاں کہے جا میرؔ

رفتار سب یہ شوخی رحم اے جواں میں | لاتا ہے تازہ آفت تو ہر زماں زمیں پر
آنکھیں لگی رہیں گی برسوں ہی سبھوں کی | ہوگا قدم کا تیرے جس جا نشاں زمیں پر
آتا نہ تھا فرو سر جن کا کل آسماں سے | ہیں ٹھوکروں میں اُن کے آج استخواں زمیں پر
جو کوئی یاں سے گزرا کیا آپ سے نہ گزرا | پانی رہا کب اتنا ہو کر رواں زمیں پر
پھر بھی اُٹھائی سر پر تم نے زمین آکر | کیا کیا ہُوا اُٹھا تم سے کچھ آگے یاں زمیں پر

کچھ بھی مناسبت ہے یاں عجز واں تکبّر — وے آسمان پر ہیں ہم ناتواں زمیں پر
پست و بلندیاں کا ہے اور ہی طرف سے — اپنی نظر نہیں ہے کچھ آسماں زمیں پر
قصرِ جناں تو ہم نے دیکھا نہیں جو کہئے — شاید نہ ہووے دل سا کوئی مکاں زمیں پر
یاں خاک سے اُنھوں کے لوگوں نے گھر بنائے — آثار ہیں جنھوں کے اب تک عیاں زمیں پر

اے صبا گر شہر کے لوگوں میں ہو تیرا گزار — کہیو ہم صحرا نوردوں کا تمامی حال زار
خاکِ دہلی سے جُدا ہم کو کیا یکبارگی — آسماں کو تھی کدورت سو نکالا یوں غبار
منصبِ بلبل غزلخوانی تھا سو وہ ہے اسیر — شاعری زاغ و زغن کا ہو نہ ہووے اب شعار
طائرِ خوش زمزمہ کنجِ قفس میں ہے خموش — چہچہے چڑیاں کریں ہیں صحنِ گلشن میں ہزار
برگِ گل سے بھی کیا نہ ایک نے ٹک ہم کو یاد — نامہ و پیغام و پرسش ہم سے اب در کنار
بے خلش کیونکر نہ ہو گرمِ سخن گلزار میں — میں قفس میں ہوں کہ میرا تھا دلوں میں اُنکے خار
بلبلِ خوش لہجہ کی جائے یہ گو غوغائیاں — طرح غوغا کی چمن میں ڈالیں پر کیا اعتبار
طائرانِ خوش لب و لہجہ نہیں رہتے چھپے — شور سے اُن کے بھرے ہیں قریہ و شہر و دیار
شہر کے کیا ایک دو کوچوں میں تھی شہرت رہی — شہروں شہروں ملکوں ملکوں ہے اُنھوں کا اشتہار
کیا کہوں سوئے چمن ہوتا جو میں سرگرمِ گشت — پھول گل جب کھلنے لگتے جوش زن ہوتی بہار
شورش سنکر غزلخوانی کا میری ہم صفیر — غنچہ ہو آتے جو ہوتا آب و رنگِ شاخسار
خوش نوائی کا جنہیں دعویٰ تھا بجاتے خموش — جنکو میں کرتا مخاطب اُن کو ہوتا افتخار
بعضوں کو رشکِ قبولِ خاطر و لطفِ سخن — بعضوں کا سینہ فگار اور بعضوں کا دل داغدار
ایک کے ہونٹوں کے اُوپر آفریں استاد تھا — ایک کہتے تھے رسوخِ دل ہے اپنا استوار
ربط کا دعویٰ تھا جن کو کہتے تھے مخلص ہیں ہم — جانتے ہیں ذاتِ سامی ہی کو ہم سب خاکسار
نقل کرتے کیا یہ صحبت منعقد جب ہوتی بزم — بیٹھ کر کہتے تھے منہ پر کے بعضے بعضے یار

بندگی ہے خدمتِ عالی میں ہم کو دیر سے — کر رکھی ہے جان اپنی ہم نے حضرت پر نثار
سو نہ خط اُن کا نہ کوئی پرچہ پہنچا مجھ تلک — واہ وا ہے رابطہ رحمت ہے یہ اخلاص و پیار
رفتہ رفتہ ہو گئیں آنکھیں بھی اب میری سفید — لیک نامے کا کیا یاروں کے میں نے انتظار
لکھتے گر دو حرف لطف آمیز بعد از چند روز — تو بھی ہوتا اس دلِ بیتاب و طاقت کو قرار
سو تو اک بنوشتہ کاغذ بھی نہ آیا میرے پاس — ان ہم آوازوں سے جن کا میں کیا ربط آشکار
خط کتابت سے یہ کہتے تھے نہ بھولیں گے تجھے — آوینگے گھر بار کی تیرے خبر کو بار بار
جب گیا میں یاد سے تب کس کا گھر کا ہیکا پاس — آفریں صد آفریں اے مردمانِ روزگار
اب بیاباں در بیاباں ہے مرا شور و فغاں — گو چمن میں خوش کی تم نے میری جائے نالہ دار
ہے مثل مشہور یہ عمرِ سفر کوتاہ ہے — طالعِ برگشتہ بھی کرتے ہیں اب امداد کار
اک پر افشانی میں بھی ہے یہ وطن گلزار سا — ہم سامعوں کی چھاتیاں نالوں سے ہو دیں گی فگار
منہ پر آویں گے سخن آلودۂ خونِ جگر — کیونکہ یارانِ زماں سے چاک ہے دل جوں انار
لب سے لے کر تا سخن ہیں خونچکاں شکوے بھرے — لیک ہے اظہار ہر ناکس سے اپنا ننگ و عار
چُپ بھلی گو تلخ کامی کھینچنی اس میں پڑی — بیتِ بحثی طبع نازک پر ہے اپنی ناگوار
آج سے کچھ بے حسابی جور کن مردم نہیں — ان سے اہلِ دل سدا کھینچے ہیں رنج بیشمار
بس قلم رکھ ہاتھ سے جانے بھی دے یہ حرف میرؔ — کاہ کے جا ہے نہیں کہسار ہوتے بے وقار
کام کے جو لوگ صاحب فن ہیں سو محسود ہیں — بے تہی کرتے رہیں گے حاسدانِ نابکار

کچھ ہو رہے گا عشق و ہوس میں بھی امتیاز — آیا ہے اب مزاج ترا امتحان پر
پہنچا نہ اُس کی داد کو مجلس میں کوئی رات — مارا بہت پتنگ نے سر شمعدان پر
تھوڑے میں دور کھینچے ہے کیا آدم آپکو — اِس مشتِ خاک کا ہے دماغ آسمان پر

فرصت سے اس چمن کی کل رو کے میں جو پوچھا
چشمک کی ایک گل نے میری طرف کو ہنس کر

اس قلقلے میں کوئی دل آشنا نہیں ہے
ٹکڑے گلے کے اپنے ناحق نہ اے جرس کر

صیاد اگر اجازت گلگشت کی نہیں ٹک
دیوار باغ کو تو بارے درِ قفس کر

صورت پرست ہوتے نہیں معنی آشنا
ہے عشق سے بتوں کے مراد عا کچھ اور

مرنے پہ جان دیتے ہیں وارفتگانِ عشق
ہے میر راہ و رسمِ دیارِ وفا کچھ اور

تھی جب تلک جوانی رنج و تعب اٹھائے
اب کیا ہے میر جی میں ترکِ ستمگری کر

چمکے ہے جب سے برق سحر گلستاں کے اور
جی لگ رہا ہے خار و خس آشیاں کے اور

یاں تابِ سعی کس کو مگر جذبِ عشق کا
لاوے اسی کو کھینچ کسو ناتواں کے اور

یا دل وہ دیدنی تھی جگہ یا کہ تجھ بغیر
اب دیکھتا نہیں ہے کوئی اس مکاں کے اور

مذہب سے میر کے کیا تجھے میرا دیار اور
میں اور یار اور مرا کاروبار اور ہے

بندے کو ان فقیروں میں گنئے نہ شہ کے میر
صاحب نے میر کے مجھ کو دیا اعتبار اور

سعی و طلب بہت کی مطلب کو تیں نہ پہنچے
ناچار اب جہاں سے بیٹھے ہیں ہاتھ اٹھا کر

ارمان ہے جنہوں کو وے اب کریں محبت
ہم تو ہوئے پشیماں دل کے تئیں لگا کر

سحر گوشِ گل میں کہا میں نے جا کر
کھلے بند مرغِ چمن سے ملا کر

لگا کہنے فرصت ہے یاں اک تبسم
سو وہ بھی گریباں میں منہ چھپا کر

تناسب پہ اعضا کی اتنا تبختر | بگاڑا تجھے خوب صورت بنا کر
قیامت رہا اضطراب اُن کے غم میں | جگر پھر گیا رات ہونٹوں پہ آ کر
مبارک تمہیں میر ہو عشق کرنا | بہت ہم تو پچھتائے دل کو لگا کر

اے مرغِ چمن صبح ہوئی زمزمہ سر کر | دم کھینچ تہِ دل سے کوئی ٹکڑے جگر کر
ہے بے خبری مجھ کو ترے دیکھے سے ساقی | ہر لحظہ مری جان مجھے میری خبر کر
پڑتے نگہ اُس شوخ کی ہوتا ہے یہ احوال | رہ جاوے ہے جیسے کہ کوئی بجلی سے ڈر کر
معشوق کا کیا وصل ورے ایسا دھرا ہے | تا شمع پتنگا بھی جو پہنچے ہے تو مر کر
جس جائے سراپا میں نظر جاتی ہے اُسکی | آتا ہے مرے جی میں یہیں عمر بسر کر
کسب اور کیا ہوتا عوض ریختہ کے کاش | پچھتائے بہت میر ہم اِس کام کو کر کر

مت اِس چمن میں غنچہ روش بود و باش کر | مانند گل شگفتہ جبیں یاں معاش کر
دل رکھ قوی فلک کی زبردستی پہ نہ جا | گر کشتی لگ گئی ہے تو تو بھی تلاش کر
ہے کیا تو جیسے غنچہ بندھی مٹھی جا چلا | مت گل کے رنگ منہ کو کھلا راز فاش کر

عشق محبت یاری میں اک لطف رکھے ہے کرنا ضبط
چھاتی پہ جو ہو کوہ الم کا تو بھی نالہ و آہ نہ کر
مانگ پناہ خدا سے بندے دل لگنا اِک آفت ہے
عشق نہ کر زنہار نہ کر واللہ نہ کر باللہ نہ کر

کیا جانئے کہ دل پر گزرے ہے میر کیا کیا | کرتا ہے بات کوئی آنکھیں پر آب کر کر

سن سن کے درد دل کو ٹولا کہ جاتے ہیں ہم
تو اپنی یہ کہانی بیٹھا ہوا کہا کر

آگے زمیں کی تہ میں ہم سے بہت تھے تو بھی
سر پر زمیں اٹھائی ہم بے تہوں نے آکر

ہم ہیں منہ ادھر کریں کیونکر
اور نیچی نظر کریں کیوں کر

یوں بھی مشکل ہے ووں بھی مشکل ہے
سر جھکائے گزر کریں کیوں کر

مہ فلک پر ہے وہ زمیں پر آہ
ان کو زیر و زبر کریں کیوں کر

دل نہیں درد مند اپنا میر
آہ و نالے اثر کریں کیوں کر

گرچہ انسان ہیں زمیں سے ڈلے
ہیں دماغ ان کے آسمانوں پر

عرش و دل دونوں کا ہے پایہ بلند
سیر رہتی ہے ان مکانوں پر

قصے دنیا میں میر بہت سنے
نہ رکھو گوش ان فسانوں پر

سوتے نہ لگ چل اس سے اے باد تو نے ظالم
بہتیر دل کو سلایا اس کو جگا جگا کر

یوسف عزیز دلہا جا مصر میں ہوا تھا
ذلت جو ہو وطن میں تو کوئی دن سفر کر

کیا حال زار عاشق کریئے بیاں نہ پوچھو
کرتا ہے بات کوئی دل کی تو چشم تر کر

اقرار میں کہاں ہے انکار کی سی خوبی
ہوتا ہے شوق غالب اس کی نہیں نہیں پر

کنج قفس میں جوں توں کاٹینگے ہم اسیراں
سیر چمن کے شایاں اپنے نہیں رہے پر

غصے میں عالم اس کا کیا کیا نظر پڑا ہے
تلواریں کھنچتیاں تھیں اسکی جبیں کی چیں پر

کہتا ہے کون تجھکو یاں یہ نہ کر تو وہ کر
پر ہو سکے تو پیارے تو دل میں ٹک جگہ کر

ردیف س

حرماں تو دیکھ پھول بکھیرے تھی کل صبا ۔۔۔ اک برگِ گل گرا نہ جہاں تھا مرا قفس
اے گریہ اسکے دل میں اثر خوب ہی کیا ۔۔۔ روتا ہوں جب میں سامنے اسکے تو دے ہے ہنس

دردمندوں سے تمہیں دور پھرا کرتے ہو کچھ ۔۔۔ پوچھنے درنہ سبھی آتے ہیں بیمار کے پاس
داغ ہوتا نظر آتا ہے دلوں کا آخر ۔۔۔ یہ جو اک خال پڑا ہے ترے رخسار کے پاس
کیا رکھا کرتے ہو آئینے سے خلوت ہر دم ۔۔۔ تاک بھی بیٹھو کسو طالبِ دیدار کے پاس

ردیف ش

شب اس دلِ گرفتہ کو وا کر بزور مے ۔۔۔ بیٹھے تھے شیرہ خانے میں ہم کتنے ہرزہ کوش
آئی صدا کہ یاد کرو دورِ رفتہ کو ۔۔۔ عبرت بھی ہے ضرور تک اے جمع تیز ہوش
جمشید جم نے وضع کیا جام کیا ہوا ۔۔۔ وے صحبتیں کہاں گئیں کیدھر گئے وہ نوش
جز لالہ اس کے جام سے پاتے نہیں نشاں ۔۔۔ ہے کوکنار اس کی جگہ اب سبو بدوش
جھومے ہیں بیدجائے جوانانِ میگسار ۔۔۔ بالائے خم ہے خشت سرِ پیرِ مے فروش
میر اس غزل کو خوب کہا تھا ضمیر نے ۔۔۔ پر اے زبان دراز بہت ہو چکی خموش

گل کو ہوتا صبا قرار اے کاش ۔۔۔ رہتی اک آدھ دن بہار اے کاش
اس میں راہِ سخن نکلتی تھی ۔۔۔ شعر ہوتا ترا شعار اے کاش

شش جہت اب تو تنگ ہے ہم پر
اِس سے ہوتے نہ ہم دوچار اے کاش

بے اجل میر اب پڑا مرنا
عشق کرتے نہ اختیار اے کاش

کیا کہئے کیا رکھیں ہیں ہم تجھ سے یار خواہش
یک جان و صد تمنا یک دل ہزار خواہش

لے ہاتھوں میں قفس ٹک صیاد چل چمن میں
مدت سے ہے ہمیں بھی سیر بہار خواہش

نے کچھ گنہ ہے دل کا نے جرم چشم اِس میں
رکھتی ہے ہم کو اتنا بے اختیار خواہش

حالانکہ عمر ساری مایوس گزری لیکن
کیا کیا رکھیں ہیں اُسکے امیدوار خواہش

بتوں کے غم میں نالاں جب نہ تب ہوں
نہ راضی خلق مجھ سے نے خدا خوش

رہا پھولوں میں کرتا زمزمہ میں
مری اِس باغ میں گزری سدا خوش

کیا پتنگے کو شمع روئے میر
اِس کی شب کو بھی ہے سحر درپیش

ردیف ظ

جو وہ ہے تو ہے زندگانی سے حظ
مزا عمر کا ہے جوانی سے حظ

نہیں وہ تو سب کچھ یہ بے لطف ہے
نہ کھانے سے لذت نہ پانی سے حظ

کہا درد دل رات کیا میر نے
اُٹھایا بہت اِس کہانی سے حظ

ردیف ف

نظر کیا کروں اسکے گھر کی طرف — نگاہیں ہیں میری نظر کی طرف
چھپاتے ہیں منہ اپنا کامل سے سب — نہیں کوئی کرتا ہنر کی طرف
بڑی دھوم سے ابر آئے گئے — نہ کوئی ہوا چشمِ تر کی طرف
اندھا دھند روتے ہیں آنکھوں سے خوں — نہیں دیکھتے ہم جگر کی طرف
رہا بے خبر گرچہ ہجراں میں میر — رہے گوش اس کی خبر کی طرف

نظر کیوں گئی رو و مو کی طرف — کھنچا جائے ہے دل کسو کی طرف
نہ دیکھو کبھو موتیوں کی لڑی — جو دیکھو مری گفتگو کی طرف
اُسے ڈھونڈتے میر کھوئے گئے — کوئی دیکھے اِس جستجو کی طرف

اے تجھ بغیر لالہ و باغ و بہار حیف — گل سے چمن بھریں ہوں نہ ہو تو ہزار حیف

ردیف ق

میر جی زرد ہوتے جاتے ہو — کیا کہیں تم نے بھی کیا ہے عشق

کچھ ہوائے مرغِ قفس لطف نجانے اُس سے — نوحہ یا نالہ ہر اک بات کا انداز ہے ایک
ناتوانی ہے نہیں جان فشانی کا دماغ — ورنہ تا باغ قفس سے مری پرواز ہے ایک
گوش کو ہوش کے ٹک کھول کے سُن شورِ جہاں — سب کی آواز کے پردے میں سخن ساز ہے ایک
چاہیے جس شکل سے تمثال صفت اُس میں آ — عالم آئینے کے مانند در باز ہے ایک

کچھ اپنی آنکھ میں آیا نہ یاں کا — خزف سے لیکے دیکھا دُرِّ تر تک
جیسے شب آگ سا دیکھا سلگتے — اُسے پھر خاک ہی پایا سحر تک

حال میر اشہر میں کہتے رہیں گے لوگ دیر — اِس فسانے کے تئیں ہونے تو دو مشہور ٹک
پشت پا مارے ہے شاہی پر گدائے کوئے عشق — دیکھو تم یاں کا خدا کیواسطے دستور ٹک

رہے ہے غش و درد دو دو پہر تک — سرِ زخم پہنچا ہے شاید جگر تک
ہوئے ہیں حواس اور ہوش و خرد گم — خبر کچھ تو آئی ہے اِس بے خبر تک
بہار آئی پر ایک پتی بھی گُل کی — نہ آئی اسیرانِ بے بال و پر تک
بہت میر برہم جہاں میں رہیں گے — اگر رہ گئے آج کی شب سحر تک

وُہ تو نہیں کہ اودھم رہتا تھا آشیاں تک — آشوبِ نالہ اب تو پہنچا ہے آسماں تک
ہجراں کی سختیوں سے پتھر دل و جگر ہیں — صبر اِس کی عاشقی میں کوئی کرے کہاں تک
دل دھڑکے ہے جو بجلی چمکے ہے سُوئے گلشن — پہنچے مبادا میری خاشاکِ آشیاں تک
دیوار دل سے بھی مارا پتھروں سے پھوڑ ڈالا — پہنچا نہ سر ہمارا حیف اُس کے آستاں تک
یہ تنگی و نزاکت اِس رنگ سے کہاں ہے — گلبرگ و غنچے پہنچیں کب اُن لب و دہاں تک

ردیف گ

بن جو کچھ بن سکے جوانی میں   رات تو تھوڑی ہے بہت ہے سانگ
میر بندوں سے کام کب نکلا   مانگنا ہے جو کچھ خدا سے مانگ

رہِ مرگ سے کیوں ڈراتے ہیں لوگ   بہت اس طرف کو تو جاتے ہیں لوگ

ردیف ل

سبزہ نورستہ رہگزار کا ہوں   سر اٹھایا کہ ہو گیا پامال
کیوں نہ دیکھوں چمن کو حسرت سے   آشیاں تھا مرا بھی یاں پرسال
ہجر کی شب کو یاں تئیں تڑپا   کہ ہوا صبح ہوتے میرا وصال

عبارت خوب لکھی شاعری انشا طرازی کی   و لے مطلب ہی گم دیکھیں تو کب ہو مدعا حاصل
بہ ہر صورت میر سر اپنا گراں گوشوں کی مجلس میں   سنے کوئی تو کچھ کہئے بھی ایسے کہنے کا حاصل

آئی بہار نکلے چمن میں ہزار گل   دل جو کھلا فسردہ تو جوں بے بہار گل

طریق عشق میں ہے رہنما دل   پیمبر دل ہے قبلہ دل خدا دل

رکا اِتنا خفا اتنا ہُوا تھا — کہ آخر خون ہو ہو کر بہا دل
جسے مارا اُسے پھر کر نہ دیکھا — ہمارا طرفہ ظالم ہے لگا دِل
گئے وحشت سے باغ و راغ میں تھے — کہیں ٹھہرا نہ دنیا سے اُٹھا دِل
اسیری میں تو کچھ واشد کبھو تھا — رہا غمگیں ہُوا جب سے رِہا دِل
ہمہ تن میں الم تھا سو نہ جانا — گرہ یہ درد ہے پہلو میں یا دِل
خموشی مجھ کو حیرت سے ہے ورنہ — بھرے ہیں لب سے لیکر شکوے تا دِل

ردیف م

ہے پیچدار از بس راہ وصال ہجراں — ان دو ہی منزلوں میں برسوں سفر کرو تم
یہ ظلم ہے تو ہم بھی اِس زندگی سے گزرے — سوگند ہے تمہیں اب جو در گزر کرو تم
روئے سخن کہاں تک غیروں کی اور آخر — ہم بھی تو آدمی ہیں ٹک منہ ادھر کرو تم
ہو عاشقوں میں اُسکے تو آؤ میر صاحب — گردن کو اپنی مو سے باریک تر کرو تم
کیا لطف ہے وگرنہ جسدم وہ تیغ کھینچے — سینہ سپر کریں ہم قطع نظر کرو تم

اگر راہ میں اُس کی رکھا ہے گام — گئے گزرے خضر علیہ السلام
دہن یار کا دیکھ چپ لگ گئی — سخن یاں ہوا ختم حاصل کلام
قیامت ہی یاں چشم و دل سے رہی — چلے بس تو واں جا کے کریئے مقام
نہ دیکھے جہاں کوئی آنکھوں کی اور — نہ لیوے کوئی جس جگہ دل کا نام

گرچہ آوارہ جوں صبا ہیں ہم
لیک لگ چلنے میں بلا ہیں ہم

کام کیا آتے ہیں گے معلومات
یہ تو سمجھے ہی نہ کہ کیا ہیں ہم

اے بتاں اِس قدر جفا ہم پر
عاقبت بندۂ خدا ہیں ہم

کوئی خواہاں نہیں ہمارا میر
گو ثیا جنسِ ناروا ہیں ہم

یہی جانا کہ کچھ نہ جانا ہائے
سو بھی اِک عمر میں ہوا معلوم

کس طور کوئی تجھ سے مقصود کرے حاصل
لے رحم ترے جی میں نے دل میں ترس ظالم

میں خاک میں ملا نہ کروں کس طرح سفر
مجھ سے غبار رکھتے ہیں اہلِ وطن تمام

کچھ ہند ہی میں میر نہیں لوگ جیب چاک
ہے میرے ریختوں کا دوا ناد کن تمام

جی کے تئیں چھپاتے نہیں یوں تو غم سے ہم
پر تنگ آگئے ہیں تمہارے ستم سے ہم

اپنے خیال ہی میں گزرتی ہے اپنی عمر
پر کچھ نہ پوچھو سمجھے نہیں جاتے ہم سے ہم

ہر ہر سخن پہ اب تو کرتے ہو گفتگو تم
اِن بدمزاجیوں کو چھوڑو گے بھی کبھو تم

چاہیں تو تم کو چاہیں دیکھیں تو تم کو دیکھیں
خواہش دلوں کی تم ہو آنکھوں کی آرزو تم

کم پائی اِس قدر ہے منزل ہے دُور اتنی
طے کس طرح کروگے یارو یہ مرحلے تم

میں کہا دیکھو ادھر ٹک تم تو میں بھی جانوں
ہنس کے بولے یہ تری باتیں ہیں پھر دیکھیں گے ہم

نہ ہوئے تھے ابھی جوان افسوس — صبرِ مغفور طاقتِ مرحوم

جب غبار اپنے دل کا نکلے ہے — دیدنی ہے آندھی کی سی دھوم

صاحب اپنا ہے بندہ پرور میرؔ — ہم جہاں سے نہ جائیں گے محروم

ردیف ن

بیکلی بیخودی کچھ آج نہیں — ایک مدت سے وہ مزاج نہیں

درد اگر یہ ہے تو مجھے بس ہے — اب دوا کی کچھ احتیاج نہیں

ہم نے اپنی سی کی بہت لیکن — مرضِ عشق کا علاج نہیں

شہرِ خوبی کو خوب دیکھا میرؔ — جنسِ دل کا کہیں رواج نہیں

اس طرح دل گیا کہ اب تک ہم — بیٹھے روتے ہیں ہاتھ ملتے ہیں

امڈی آتی ہیں آج یوں آنکھیں — جیسے دریا کہیں اُبلتے ہیں

دمِ آخر ہے بیٹھ جا مت جا — صبر کر ٹک کہ ہم بھی چلتے ہیں

تیرے بیخود جو ہیں سو کیا چیتیں — ایسے ڈوبے کہیں اُچھلتے ہیں

دیں عمرِ خضر موسمِ پیری میں تو نہ لے — مرنا ہی اس سے خوب ہے عہدِ شباب میں

متصل روتے ہی رہیے تو بجھے آتشِ دل — ایک دو آنسو تو اور آگ لگا جاتے ہیں

وقت خوش اُن کا جو ہم بزم ہیں تیرے ہم تو — در و دیوار کو احوال سنا جاتے ہیں

ایک بیمارِ جدائی ہوں میں آپ ہی تس پر
پوچھنے والے جدا جان کو کھا جاتے ہیں

میر صاحب بھی ترے کوچے میں شب آتے ہیں
جیسے دریوزہ گری کرنے گدا جاتے ہیں

اسکے کوچے میں نہ کر شورِ قیامت کا ذکر
شیخ یاں ایسے تو ہنگامے ہوا کرتے ہیں

بے بسی سے تو تری بزم میں ہم بہرے بنے
نیک و بد کوئی کہے بیٹھے سنا کرتے ہیں

فرصتِ خواب نہیں ذکرِ بتاں میں ہم کو
رات دن رام کہانی سے کہا کرتے ہیں

یہ زمانہ نہیں ایسا کہ کوئی زیست کرے
چاہتے ہیں جو برا اپنا بھلا کرتے ہیں

محض ناکارہ بھی مت جان ہمیں تو کہ کہیں
ایسے ناکام بھی بے کار پھرا کرتے ہیں

تجھ بن اس جانِ مصیبت زدہ غمدیدہ پہ ہم
کچھ نہیں کرتے تو افسوس کیا کرتے ہیں

کیا کہیں میر جی ہم تم سے معاش اپنی غرض
غم کو کھایا کریں ہیں لوہو پیا کرتے ہیں

پڑھتے پھرینگے گلیوں میں ان ریختوں کو لوگ
مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں

زباں رکھ غنچہ ساں اپنے دہن میں
بندھی مٹھی چلا جا اس چمن میں

کہاں عاجز سخن قادر سخن ہوں
ہمیں ہے شبہ یاروں کے سخن میں

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

کس کا ہے قماش ایسا گودڑ بھرے ہیں سارے
دیکھو نہ جو لوگوں کے دیوان نکلتے ہیں

دعوے کو یار آگے معیوب کر چکے ہیں
اِس ریختے کو ورنہ ہم خوب کر چکے ہیں

مرنے سے تم ہمارے خاطر نچنت رکھیو
اس کام کا بھی ہم کچھ اسلوب کر چکے ہیں

حسنِ کلام کھینچے کیونکر نہ دامنِ دل
اِس کام کو ہم آخر محبوب کر چکے ہیں

اپنی ہی سیر کرنے ہم جلوہ گر ہوئے تھے
اِس رمز کو ولیکن معدود جانتے ہیں

کچھ کچھ کہوں گا روز یہ کہتا تھا دل میں میں
آشفتہ طبع میر کو پایا اگر کہیں

سو کل ملا مجھے وہ بیاباں کی سمت کو
جاتا تھا اضطراب زدہ سا اُدھر کہیں

تک چل کے میں برنگِ صبا یہ اُسے کہا
کاے خانماں خراب ترا بھی ہے گھر کہیں

آشفتہ جا بجا جو پھرے ہے تو دشت میں
جاگہ نہیں ہے شہر میں تجھ کو مگر کہیں

آسودگی سے جنس کو کرتا ہے کون سوخت
جانے ہے نفع کوئی بھی جی کا ضرر کہیں

موتی سے تیرے اشک ہیں غلطاں کسو طرف
یاقوت کے سے ٹکڑے ہیں لختِ جگر کہیں

تا کے یہ دشت گردی و کب تک یہ خستگی
اِس زندگی سے کچھ تجھے حاصل ہے مر کہیں

کہنے لگا وہ ہو کے پرآشفتہ یک بیک
مسکن کرے ہے دہر میں مجھ سا بشر کہیں

آوارگاں کو ننگ ہے سننا نصیحتیں
مت کہیو ایسی بات تو بارِ دگر کہیں

تعیینِ جا کو بھول گیا ہوں یہ یہ ہے یاد
کہتا تھا ایک روز یہ اہلِ نظر کہیں

بیٹھے اگرچہ نقش ترا تو بھی دل اُٹھا
کرتا ہے جائے باش کوئی رہگزر کہیں

کتنے ہی آئے لے گئے سر پر خیال میر
ایسے گئے کہ کچھ نہیں اُن کا اثر کہیں

نہ تنگ کر اسے اے فکرِ روزگار کہ میں
دل اِس سے دم کے لئے مستعار لایا ہوں

جفائیں دیکھ لیاں بیوفائیاں دیکھیں
بھلا ہوا کہ تری سب برائیاں دیکھیں

ٹک سن کہ سو برس کی ناموسِ خامشی کھو
دو چار دن کی باتیں اب منہ پہ آئیاں ہیں

میں کون ہوں اے ہم نفساں سوختہ جاں ہوں
اک آگ مرے دل میں ہے جو شعلہ فشاں ہوں

لایا ہے مرا شوق مجھے پردے سے باہر
میں ورنہ وہی خلوتیِ راز نہاں ہوں

جلوہ ہے مجھی سے لبِ دریائے سخن پر
صد رنگ مری موج ہے میں طبعِ رواں ہوں

پنجہ ہے مرا پنجۂ خورشید میں ہر صبح
میں شانہ صفت سایہ روِ زلفِ بتاں ہوں

دیکھا ہے مجھے جن نے سو دیوانہ ہے میرا
میں باعثِ آشفتگیِ طبعِ جہاں ہوں

تکلیف نہ کر آہ مجھے جنبشِ لب کی
میں صد سخن آغشتہ بخوں زیرِ زباں ہوں

ہوں زرد غمِ تازہ نہالانِ چمن سے
اس باغِ خزاں دیدہ میں میں برگِ خزاں ہوں

رکھتی ہے مجھے خواہشِ دل بسکہ پریشاں
در پے نہ ہو اس وقت خدا جانے کہاں ہوں

اک وہم نہیں بیش مری ہستیِ موہوم
اس پر بھی تری خاطرِ نازک پہ گراں ہوں

تا پھونکئے نہ خرقۂ طامات کے تئیں
حسنِ قبول کیا ہو مناجات کے تئیں

سیّد ہو یا چمار ہو اس جا وفا ہے شرط
کیا عاشقی میں پوچھتے ہیں ذات کے تئیں

آخر کے یہ سلوک ہم اب تیرے دیکھ کر
کرتے ہیں یاد پہلی ملاقات کے تئیں

ایکدم پر ہے بنا تیری سو آیا کہ نہیں
وہ کچھ اس زندگی میں کر کہ تجھے یاد کریں

ریختہ خوب ہی کہتا ہے جو انصاف کرو
چاہیے اہلِ سخن میر کو استاد کریں

ملنے لگے ہو دیر دیر دیکھئے کیا ہے کیا نہیں
تم تو کرو ہو صاحبی بندے میں کچھ رہا نہیں

بوئے گل اور رنگِ گل دونوں ہیں دلکش اے نسیم
لیک بقدرِ یک نگاہ دیکھئے تو وفا نہیں

شکوہ کروں ہوں بخت کا اتنے غضب نہ ہو بتاں — مجھ کو خدانخواستہ تم سے تو کچھ گلا نہیں
نالے کیا نہ کر سنا نوحے مرے پہ عندلیب — بات میں بات عیب ہے میں نے تجھے کہا نہیں
چشمِ سفید اشکِ سرخ آہ دلِ حزیں ہے یاں — شیشہ نہیں ہے مے نہیں ابر نہیں ہوا نہیں
ایک فقط ہے سادگی تس پہ بلائے جاں ہے تو — عشوہ کرشمہ کچھ نہیں آن نہیں ادا نہیں
آب و ہوائے ملکِ عشق تجربہ کی ہے میں بہت — کر کے دوائے دردِ دل کوئی بھی پھر جیا نہیں

تجھ عشق میں تو مرنے کو تیار بہت ہیں — یہ جرم ہے تو ایسے گنہگار بہت ہیں
کوئی تو زمزمہ کرے میرا سا دلخراش — یوں تو قفس میں اور گرفتار بہت ہیں

خوبرو سب کی جان ہوتے ہیں — آرزوئے جہان ہوتے ہیں
کبھو آتے ہیں آپ میں تجھ بن — گھر میں ہم میہمان ہوتے ہیں

کیا رہا ہے مشاعرے میں اب — لوگ کچھ جمع آن ہوتے ہیں
میرؔ و مرزا رفیع و خواجہ میرؔ — کتنے اک یہ جوان ہوتے ہیں

جنوں میرے کی باتیں دشت اور گلشن میں جب چلیاں — نہ چوبِ گل نے دم مارا نہ چھڑیاں بید کی ہلیاں
تفاوت کچھ نہیں شیریں شکر اور یوسف میں — سبھی معشوق اگر پوچھے کوئی مصری کی ہیں لیاں
دِوانا ہو گیا تو میرؔ آخر ریختہ کہہ کہہ — نہ کہتا تھا میں اے ظالم کہ یہ باتیں نہیں بھلیاں

بزم میں جو ترا ظہور نہیں — شمعِ روشن کے منہ پہ نور نہیں
کتنی باتیں بنا کے لاؤں ایک — یاد رہتی ترے حضور نہیں

فکر مت کر ہمارے جینے کا — تیرے نزدیک کچھ یہ دور نہیں
پھر جیئنگے جو تجھ سا ہے جاں بخش — ایسا جینا ہمیں ضرور نہیں
عام ہے یار کی تجلّی میر — خاص موسےٰ و کوہ طور نہیں

داماں و جیب و دیدہ و مژگان و آستیں — اب کون سا رہا ہے کہ اُن میں سے تر نہیں

مسجد سے میکدے پر کاش ابر روز برسے — واں روسفیدیاں ہیں یاں روسیاہیاں ہیں
غالب تو یہ ہے زاہد رحمت سے دور ہووے — درکار واں گنہ ہیں یاں بے گناہیاں ہیں
شاہد اوں میر کس کو اہل محلّہ سے ہیں — محضر پہ خوں کے میرے سب کی گواہیاں ہیں

تجھے بھی یار اپنا یوں تو ہم ہر بار کہتے ہیں — و لے کم ہیں بہت وے لوگ جن کو یار کہتے ہیں
سمجھ کر ذکر کر آسودگی کا مجھ سے اے ناصح — وہ میں ہی ہوں کہ جس کو عاقبت بیزار کہتے ہیں
عجب ہوتے ہیں شاعر بھی میں اس فرقے کا عاشق ہوں — کہ بے دھڑکے بھری مجلس میں یہ اسرار کہتے ہیں

داد لے چھوڑوں میں صیّاد سے اپنی لیکن — ضعف سے میرے تئیں طاقت فریاد نہیں
کیا لکھوں میر فراموش کیا اُن نے تجھے — میں تو تقریب بھی کی پر تو اُسے یاد نہیں

یک لحظہ سینہ کوبی سے فرصت ہمیں نہیں — یعنے کہ دل کے جانے کا ماتم بہت ہے یاں
ہم رہروانِ راہ فنا دیر رہ چکے — وقفہ بسان صبح کوئی دم بہت ہے یاں
اِس بتکدے میں معنی کا کس سے کریں سوال — آدم نہیں ہے صورت آدم بہت ہے یاں
عالم میں لوگ ملنے کے گو اب نہیں رہے — ہر چند ایسا ویسا تو عالم بہت ہے یاں

ویسا چمن سے سادہ نکلتا نہیں کوئی — رنگینی ایک اور خم و چم بہت ہے یاں
شاید کہ کام صبح تک اپنا کھنچے نہ میرؔ — احوال آج شام سے درہم بہت ہے یاں

کھول کر دیوان میرا دیکھ قدرت مدعی — گرچہ ہوں میں نوجواں پر شاعروں کا پیر ہوں

سکے ہے کوہکن کر فکر میری خستہ حالی میں — الٰہی شکر کرتا ہوں تری درگاہِ عالی میں
میں وہ پژمردہ سبزہ ہوں کہ ہو کر خاک سے سرزد — یکایک آگیا اس آسماں کی پائمالی میں

نہ کیونکہ شیخ توکل کو اختیار کریں — زمانہ ہووے مساعد تو روزگار کریں
گیا وہ زمزمۂ صبح فصلِ گل بلبل — دعا نہ پہنچی چمن تک ہم اب ہزار کریں
تمام صید سرِ تیر جمع ہیں لیکن — نصیب اس کے کہ جس کو ترا شکار کریں

تو اک زباں پہ چپکی نہیں رہتی عندلیب — رکھتا ہے منہ پہ غنچۂ گل سو زباں کے تئیں
ہم تو ہوئے تھے میرؔ سے اس دن ہی ناامید — جبدن سنا کہ ان نے دیا دل بتاں کتیں

موئے سہتے سہتے جفاکاریاں — کوئی ہم سے سیکھے وفاداریاں
ہماری تو گزری اسی طور عمر — یہی نالہ کرنا یہی زاریاں
فرشتہ جہاں کام کرتا نہ تھا — مری آہ نے برچھیاں ماریاں
گیا جان سے یک جہاں لیک شوخ — نہ تجھ سے گئیں یہ دل آزاریاں
خط و کاکل و زلف و انداز و ناز — ہوئیں دامِ رہ صد گرفتاریاں
کیا درد و غم نے مجھے ناامید — کہ مجنوں کو یہ بھی تھیں بیماریاں

تری آشنائی سے ہی حد ہوئی / بہت کی تھیں دنیا میں ہم یاریاں
نہ بھائی ہماری تو قدرت نہیں / کھنچیں میر تجھ سے ہی یہ خواریاں

دن نہیں رات نہیں صبح نہیں شام نہیں / وقت ملنے کا مگر داخل ایام نہیں
مثل عنقا مجھے تم دور سے سن لو ورنہ / ننگ ہستی ہوں مری جائے بجز نام نہیں
بے قراری جو کوئی دیکھے ہے سو کہتا ہے / کچھ تو ہے میر کہ اک دم تجھے آرام نہیں

آرزوئیں ہزار رکھتے ہیں / تو بھی ہم دل کو مار رکھتے ہیں
برق کم حوصلہ ہے ہم بھی تو / دلکے بے قرار رکھتے ہیں
غیر ہے مورد عنایت ہائے / ہم بھی تو تم سے پیار رکھتے ہیں
نہ نگہ نے پیام نے وعدہ / نام کو ہم بھی یار رکھتے ہیں
ہم سے خوش زمزمہ کہاں یوں تو / لب و لہجہ ہزار رکھتے ہیں
چوٹٹے دل کے ہیں بتاں مشہور / بس یہی اعتبار رکھتے ہیں
پھر بھی کرتے ہیں میر صاحب عشق / ہیں جواں اختیار رکھتے ہیں

یہ جو چشم پر آب ہیں دونوں / ایک خانہ خراب ہیں دونوں
رونا آنکھوں کا روئیے کیتک / پھوٹنے ہی کے باب ہیں دونوں
ہے تکلف نقاب وے رخسار / کیا چھپیں آفتاب ہیں دونوں
تن کے معمورے میں یہی دل و چشم / گھر تھے دو سو خراب ہیں دونوں
کچھ نہ پوچھو کہ آتش غم سے / جگر و دل کباب ہیں دونوں
ایک سب آگ ایک سب پانی / دیدہ و دل عذاب ہیں دونوں

آگے دریا تھے دیدۂ تر میر
اب جو دیکھو سراب ہیں دونوں

مدعی مجھ کو کھڑے صاف برا کہتے ہیں
چپکے تم سنتے ہو بیٹھے اسے کیا کہتے ہیں
دیکھے خوباں کے بجا دل نہیں رہتا ہرگز
لوگ جو کچھ نہیں کہتے ہیں بجا کہتے ہیں
حسن تو ہے ہی کرو لطف زباں بھی پیدا
میر کو دیکھو کہ سب لوگ بھلا کہتے ہیں

دیر و حرم سے تو تو ٹک گرم ناز نکلا
ہنگامہ ہو رہا ہے اب شیخ و برہمن میں
ہیں گھاؤ دل پر اپنے تیغ زباں سے سب کی
تب درد ہے ہمارے اے میر ہر سخن میں

طائرانِ خوش معاش اس باغ کے تھے ہم کبھو
اب ترستے ہیں قفس میں اک پرافشانی کہیں
دل جو پانی ہو تو آئینہ ہے روئے یار کا
خانہ آبادی سمجھ اس خانہ ویرانی کہیں
فہم میں میرے نہ آیا پردہ در ہے طفل اشک
روؤں کیا اے ہمنشیں میں اپنی نادانی کہیں

کیا کہوں اول بیخود تو دیر میں آتا ہوں میں
پھر جو یاد آتا ہے وہ چپکا سا رہ جاتا ہوں میں

کیا جانوں دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میر کے
کچھ طرز ایسی بھی نہیں ایہام بھی نہیں

کعبے جانے سے نہیں کچھ مجھ کو اتنا شوق ہے
چال وہ بتلا کہ میں دل میں کسو کے جا کروں
اب کے ہمت صرف کر جو اس سے جی اچٹے مرا
پھر وہی اے میر مت کریو اگر ایسا کروں

عشق میں جی کو صبر و تاب کہاں
اس سے آنکھیں لگیں تو خواب کہاں

ہستی اپنی ہے بیچ میں پردہ — ہم نہ ہوویں تو پھر حجاب کہاں
گریۂ شب سے سرخ ہیں آنکھیں — مجھ بلانوش کو شراب کہاں
عشق کا گھر ہے میر سے آباد — ایسے پھر خانماں خراب کہاں

میں تو خوباں کو جانتا ہی ہوں — پر مجھے بھی یہ خوب جانے ہیں
اب تو افسردگی ہی ہے ہر آن — وے نہ ہم ہیں نہ وے زمانے ہیں
قیس و فرہاد کے وہ عشق کے شور — اب مرے عہد میں فسانے ہیں
مشک و سنبل کہاں وہ زلف کہاں — شاعروں کے یہ شاخسانے ہیں
عشق کرتے ہیں اس پری رو سے — میر صاحب بھی کیا دوانے ہیں

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے — دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

گل پھول کوئی کب تک جھڑ جھڑ کے گرتے دیکھے — اس باغ میں بہت اب جوں غنچہ میں کاہوں

کب شب ہوئی زمانے میں جو پھر ہوا نہ روز — کیا اے فراقِ یار تجھی کو سحر نہیں
ہر چند ہم کو مستوں سے صحبت رہی ہے لیک — دامن ہمارا ابر کے مانند تر نہیں

میں جی سنبھالتا ہوں وہ ہنسکے ٹالتا ہے — یاں مشکلیں ہیں ایسی واں یہ مسالے ہیں

جوشِ غم ہوتے بھی ہیں یوں تر روتے بھی ہیں — چشمِ جہاں آشوب سے دریا بہایا ایک میں
الب صورت سبھی مجھ پہ ستم کیوں اسقدر — کیا مجرمِ عشقِ بتاں یاں ہوں خدایا ایک میں

بجلی سے یوں چمکے بہت پر بات کہتے ہو چکے
جوں ابر ساری خلق پر ہوں اب تو چھایا ایک میں

صبح چمن کا جلوہ ہندی بتوں میں دیکھا
صندل بھری جبیں میں ہو نتوں کی لالیاں ہیں

اجماع یوا ہوس کو رکھ رکھ لیا ہے آگے
مت جان ایسی بھیڑیں جاں دینے والیاں ہیں

اِن گلرخوں کی قامت لہکے ہے یوں ہوا میں
جس رنگ سے لچکتی پھولوں کی ڈالیاں ہیں

رفتگاں میں جہاں کے ہم بھی ہیں
ساتھ اِس کارواں کے ہم بھی ہیں

جس چمن زار کا ہے تُو گُل تر
بُلبل اس گلستاں کے ہم بھی ہیں

وجہ بیگانگی نہیں معلوم
تم جہاں کے ہو واں کے ہم بھی ہیں

مر گئے مر گئے نہیں تو نہیں
خاک سے منہ کو ڈھانکے ہم بھی ہیں

زبانیں بدلتے ہیں ہر آن خوباں
یہ سب کچھ ہیں بگڑے زمانے کی باتیں

ہمیں دیر و کعبے سے کیا گفتگو ہے
چلی جاتی ہیں یہ سیانے کی باتیں

کچھ تمہیں ملنے سے بیزار ہو میرے ورنہ
دوستی ننگ نہیں عیب نہیں عار نہیں

ناز و انداز و ادا غمزہ و اعراض و حیا
آب و گل میں ترے سب کچھ ہے یہی پیار نہیں

صورت آئینے میں ٹک دیکھ تو کیا صورت ہے
بدزبانی تجھے اِس منہ پہ سزاوار نہیں

دل کے الجھاؤ کو کیا تجھ سے کہوں اے ناصح
تو کسو زلف کے پھندے میں گرفتار نہیں

جہاں سے دیکھئے اک شور انگیز نکلے ہے
قیامت کا سا ہنگامہ ہے ہر جا میرے

اب پست و بلند ایک ہے جُوں نقشِ قدم یاں — پامال ہوا خوب تو ہموار ہوا میں
کیا جیتنے کا فائدہ جو شیب میں جیتا — سونے کا سماں آیا تو بیدار ہوا میں

جائے ہے جی نجات کے غم میں — ایسی جنت گئی جہنّم میں
بے خودی پر نہ میرؔ کی جاؤ — تُم نے دیکھا ہے اور عالم میں

مجھ کو دماغ وصفِ گل و یاسمن نہیں — میں جُوں نسیم بادِ فروشِ چمن نہیں

تم کہو میرؔ کو چاہو سو کہ چاہیں ہیں تمہیں — اور ہم لوگ تو سب اُن کا ادب کرتے ہیں

نئی گردش ہے اس کی ہر زماں میں — خلل سا ہے دماغِ آسماں میں
کہا میں دردِ دل یا آگ اُگلی — پھپھولے پڑ گئے میری زباں میں
تری شورش بھی بے کل ہے مگر میرؔ — ملا دی ہیں کہ بجلی فغاں میں

محبُوب کا وصال نہ مجھ کو ہُوا نصیب — دل سے ہزار خواہشیں سر کو ٹپک گئیں
بھر دی تھی چشمِ ساقی میں یارب کہاں کی مے — مجلس کی مجلسیں نظر اک کرتے جھک گئیں

غزل میرؔ کی کب پڑھائی نہیں — کہ حالت مجھے غش کی آئی نہیں
زباں سے ہماری ہے صیّاد خوش — ہمیں اب امیدِ رہائی نہیں
نسیم آئی میرے قفس میں عبث — گلستاں سے دو پھول لائی نہیں

اس شہ حسن کا اقبال کہ ظالم کے تئیں
ہر طرف سیکڑوں درویش دعا دیتے ہیں
طرفہ صناع ہیں اے میر یہ موزوں طبعاں
بات جاتی ہے بگڑ بھی تو بنا دیتے ہیں

پنج روزہ عمر کریئے عاشقی یا زاہدی
کام کچھ چلتا نہیں اس تھوڑی سی مہلت بیچ یاں
کیا سر جنگ و جدل ہو بیدماغ عشق کو
صلح کی ہے میر نے ہفتاد و دو ملت بیچ یاں

پھرا میں صورت احوال ہر اک کو دکھاتا یاں
مروت قحط ہے آنکھیں نہیں کوئی ملاتا یاں
خرابہ دہلی کا وہ چند بہتر لکھنؤ سے تھا
وہیں میں کاش مر جاتا سراسیمہ نہ آتا یاں

دن ہیں بڑے کبھو کے راتیں بڑی کبھو کی
رہتے نہیں ہیں یکساں لیل و نہار دونوں

پیری ہی اب تو کہئے سو کیا کہئے ہم نشیں
کس رنج و غم میں گزریں ہیں اپنی جوانیاں
ظلم و ستم سے خون کیا پھر دبا رہا
برباد کیا گئیں ہیں مری جانفشانیاں
میں آپ چھیڑ چھیڑ کے کھاتا ہوں گالیاں
خوش آگئیں ہیں اسکی مجھے بدزبانیاں
سنتا نہیں ہے شعر بھی وہ حرف ناشنو
دل ہی میں خوں ہوا کیں مری نکتہ دانیاں
باتیں کڈھب رقیب کی ساری ہوئیں قبول
مجھ کو جو ان سے عشق تھا میری نمانیاں
مجلس میں تو خفیف ہوئے اسکے واسطے
پھر اور ہم سے اٹھتی نہیں سرگرانیاں
عالم کے ساتھ جائیں چلے کس طرح نہ ہم
عالم تو کاروان ہے ہم کاروانیاں

دلی میں کہاں شور ایسا دھرا تھا
کسو کا مگر دل رکھا تھا جرس میں
ہمیں عشق میں بیکسی بے بسی ہے
نہ دشمن بھی ہو دوستی کے تو بس میں

تنِ زار لاغر ہیں ظاہر رگیں ہیں
بھرا ہے مگر عشق اک ایک نس میں
محبت وفا مہر کرتے تھے باہم
اٹھا دی ہیں وے تم نے اب ساری رسمیں

غمِ ہجراں میں گھبرا کر اٹھا میں
طرف گلزار کے آیا چلا میں
شگفتہ خاطری اس بن کہاں تھی
چمن میں غنچہ پیشانی رہا میں
کسو سے دل نہیں ملتا ہے یارب
ہوا تھا کس گھڑی ان سے جدا میں
تعارف ہم صفیروں سے نہیں کچھ
ہوا ہوں ایک مدت میں رہا میں
گیا صبر آخر آزار دلی پر
بہت کرتا رہا دارو دوا میں
ہوا تھا میرؔ مشکل عشق میں کام
کیا پتھر جگر تب کی دوا میں

فریاد سے کیا لوگ ہیں ان ہی کو عجب ہے
رہتی ہے خلش نالوں سے میرے دلِ شب میں

اس کو دل سا مکان دیتے ہیں
اہل اس گھر پہ جان دیتے ہیں
کیونکہ خوشخواں نہ ہوویں اہلِ چمن
ہم انھوں کو زبان دیتے ہیں
جان کیا گوہرِ گرامی ہے
بدلے اسکے جہان دیتے ہیں

کوئی سبب ایسا ہو یارب جس سے عزت رہجاوے
عالم میں اسباب کے ہیچ ہیں پاس اپنے اسباب نہیں
رنگ شکستہ دل ہے شکستہ سر ہے شکستہ مستی میں
حال کسو کا اپنا سا اس میخانے میں خراب نہیں

مے کشی صبح و شام کرتا ہوں
فاقہ مستی مدام کرتا ہوں
کوئی ناکام یوں رہے کبتک
میں بھی اب ایک کام کرتا ہوں

یا تو لیتا ہوں دادِ دل یا اب — کام اپنا تمام کرتا ہوں

اس سے گھبرا کے جو کچھ کہنے پہ آجاتا ہوں — دل کی پھر دل میں لئے چپکا چلا جاتا ہوں
سعیٔ دشمن کو نہیں دخل مری ایذا میں — رنج سے عشق کے میں آپ کھپا جاتا ہوں
گرچہ کھویا سا گیا ہوں پہ تہ حرف سخن — اس فریبندۂ عشاق کی پا جاتا ہوں
خشم کیوں بے مرگی کاہیکو بے لطفی کیا — بد بر اتنا بھی نہ ہو مجھ سے بھلا جاتا ہوں
استقامت سے ہوں جوں کوہ قوی دل لیکن — ضعف سے عشق کے ڈھہتا ہوں گرا جاتا ہوں
مجلسِ یار میں تو بار نہیں پاتا میں — در و دیوار کو احوال سنا جاتا ہوں
اک بیاباں ہے مری بیکسی و بے تابی — جیسے آوازِ جرس میں سے جدا جاتا ہوں
تنگ آوے گا کہاں تک نہ مرا قلب سلیم — بگڑی صحبت کے تئیں روز بنا جاتا ہوں

اب دیکھیں آہ کیا ہو ہم وے جدا ہوئے ہیں — بے یار و بے دیار و بے آشنا ہوئے ہیں
غیر سے نام اس کا آیا نہیں زباں پر — آگے خدا کے جب ہم محوِ دعا ہوئے ہیں
اہلِ چمن سے کیونکر اپنی ہو روشناسی — برسوں اسیر رکھ کر اب ہم رہا ہوئے ہیں

بے کار مجھ کو مت کہہ میں کار آمدہ ہوں — بیگانہ وضع تو ہوں پر آشنا زدہ ہوں
میں منہ نہیں لگایا بنت العنب کو گاہے — تب تھا جوان صالح اب پیر میکدہ ہوں

اسرار دل کے کہتے ہیں پیر و جوان میں — مطلق نہیں ہے بندِ ہماری زبان میں
رنگینیٔ زمانہ سے خاطر نہ جمع رکھ — سو رنگ بدلے جاتے ہیں یاں ایک آن میں
شاید بہار آئی ہے دیوانے ہیں جواں — زنجیر کی سی آتی ہے جھنکار کان میں

موئے پر اور بھی کچھ بڑھ گئی رسوائی عاشق | کہ اس کی نعش کو اب شہر میں تشہیر کرتے ہیں
در و دیوار افتادہ کو بھی کاش اک نظر دیکھیں | عمارت ساز مردم گھر جو اب تعمیر کرتے ہیں

سا عشق کرنا نہیں آسان بہت مشکل ہے | چھاتی پتھر کی ہے اُن کی جو وفا کرتے ہیں

نا آشنا کے اپنے جیسے ہم آشنا ہیں | اس طور اس طرح کے ایسے کم آشنا ہیں
باہم جو یاریاں ہیں اور آشنائیاں ہیں | سب ہیں نظر میں اپنی ہم عالم آشنا ہیں

کیا جنوں ہے تم کو جو تم طالبِ ویرانہ ہو | جس کو فردوسِ بریں کہتے ہیں واں آدم کہاں

سر گو کہ بتخانہ جا رہا ہوں میں | بخدا باخدا رہا ہوں میں
سا سب گئے دل دماغ تاب و تواں | میں رہا ہوں سو کیا رہا ہوں میں
سر برق تو میں نہ تھا کہ جل بجھتا | ابر تر ہوں کہ چھا رہا ہوں میں

کچھ اور شے ہے خوب جو دیکھو رُخِ نگار | ہر چند گُل بھی تازہ کھلا اتنا بد نہیں
اِس بیکسی سے کون جہاں میں موا کہ میں | جز داغِ سینہ آج چراغِ لحد نہیں
بے سوزِ دل کنہوں نے کیا ریختہ تو کیا | گفتارِ خام پیشِ عزیزاں سند نہیں
سو بار مست کعبے میں پکڑے گئے ہیں ہم | رسوائی کے طریق سے کچھ نابلد نہیں
لطفِ سخن بھی پیری میں رہتا نہیں ہے میر | اب شعر ہم پڑھے ہیں تو وہ شد و مد نہیں

جو جو ظلم کئے ہیں تم نے سو سو ہم نے اٹھائے ہیں
داغ جگر پہ جلائے ہیں چھاتی پہ جراحت کھائے ہیں

تیغ دریغ نہیں ہے اسکی بسمل گہ میں کسو سے بھی
ہیں تو شکار لاغر ہم پر ایک امید پہ آئے ہیں

خم سے لگی میخانے کی دیوار بھی اپنے گھر کی ہے
لطف پیر مغان عجب کیا ہم آخر ہمسائے ہیں

شوق ہے غم میں بے صبری ہے آہ کسو کو کیا کہئے
اچھے اپنے دلکو ہم نے آپ ہی روگ لگائے ہیں

محو سخن ہم فکر سخن میں رفتہ ہی بیٹھے رہتے ہیں
آپ کو جب کھویا ہے ہم نے تب سے گوہر پائے ہیں

تب تھے سپاہی اب ہیں جوگی آہ جوانی یوں کاٹی
ایسی تھوڑی رات میں ہم نے کیا کیا سوانگ بنائے ہیں

کون وہ ایسا ظالم تھا استاد فن عیاری کا
اتنے سن میں جن نے تجھ کو ایسے فریب سکھائے ہیں

میر مقدس آدمی ہیں تھے سبحہ بکف میخانے میں
صبح جو ہم بھی جا نکلے تو دیکھ کے کیا شرمائے ہیں

کہے کون صید رمیدہ سے کہ ادھر بھی پھر کے نظر کرے
کہ نقاب اُلٹے سوار ہے ترے پیچھے کوئی غبار میں

تری شام خط کے قریب کے جو صفا میں دیکھی ہیں خوبیاں
نہ سمیں یہ گل میں نظر پڑے نہ یہ رنگ صبح بہار میں

کوئی شعلہ ہے کہ شرارہ ہے کہ ہوا ہے یہ کہ ستارہ ہے
یہی دل جو لے کے گڑیں گے ہم تو لگے گی آگ مزار میں

جھکی کچھ کہ جی میں جبھی سبھی ہلی ٹک کہ دل میں کھبی سبھی
یہ جو لاگ پلکوں میں اس کی ہے نہ چھری میں ہے نہ کٹار میں

ردیف و

ہوئے تھے جیسے مرجاتے پر اب تو سخت حسرت ہے
کیا دشوار نادانی سے ہم نے کار آساں کو

تجھے گر چشمِ عبرت ہے تو آندھی اور بگولے سے
تماشا کر غبار افشانیِ خاکِ عزیزاں کو

غم و اندوہ و بیتابی الم بے طاقتی حرماں
کہوں اے ہمنشیں تا چند غمہائے فراواں کو

کوئی کانٹا سرِ راہ کا ہماری خاک پر بس ہے
گلِ گلزار کیا درکار ہے گورِ غریباں کو

کیا سیر اس خرابی کا بہت اب چل کے سو رہیئے
کسو دیوار کے سائے میں منہ پر لیکے داماں کو

کہتے ہو اتحاد ہے ہم کو
ہاں کہو اعتماد ہے ہم کو

شوق ہے شوق ہے نہیں معلوم
اِس سے کیا دل نہاد ہے ہم کو

آہ کس ڈھب سے رویئے کم کم
شوق حد سے زیاد ہے ہم کو

شیخ و پیرِ مغاں کی خدمت میں
دل سے اِک اعتقاد ہے ہم کو

نامرادانہ زیست کرتا تھا
میرؔ کا طور یاد ہے ہم کو

خدا کرے کہ نصیب اپنے ہو نہ آزادی
کدھر کے ہو جے جو بے بال پر رہائی ہو

اُس آفتاب سے تو فیض سب کو پہنچے ہے
یقین ہے کہ کچھ اپنی ہی نارسائی ہو

ہزار مرتبہ بہتر ہے بادشاہی سے
اگر نصیب ترے کوچے کی گدائی ہو

مغاں سے راہ تو ہو جاوے رفتہ رفتہ شیخ
ترا بھی قصد اگر ترکِ پارسائی ہو

تا چند کوچہ گردی جیسے صبا زمیں پر
اے آہ صبحگاہی آشوبِ آسماں ہو

گر ذوقِ سیر ہے تو آوارہ اس چمن میں
مانندِ عندلیب گم کردہ آشیاں ہو

ہم دورِ ماندگاں کی منزل رساں مگر اب
یا ہو صدائے جرس کی یا گردِ کارواں ہو

یہ جان تو کہ ہے اِک آوارہ دست بردل
خاکِ چمن کے اوپر برگِ خزاں جہاں ہو

ہمسائے اُس چمن کے کتنے شکستہ پر ہیں / اتنے لئے کہ شاید اک بادِ گلفشاں ہو

دن گزرتا ہے مجھے فکر ہی میں تا کیا ہو / رات جاتی ہے اِسی غم میں کہ فردا کیا ہو
ایک رونا ہی نہیں آہ غم و نالہ و درد / ہجر میں زندگی کرنے کے تئیں کیا کیا ہو

جاتے نہیں اٹھائے یہ شور ہر سحر کے / یا اب چمن میں بلبل ہم ہی رہیں گے یا تو
عالم ہے شوق کشتہ خلقت ہے تیری رفتہ / جانوں کی آرزو تو آنکھوں کا مدعا تو
گفت و شنود اکثر میرے ترے رہے ہے / ظالم معاف رکھیو میرا کہا سنا تو
کہ سانجھ کے موئے کو اے میر روئیں کب تک / جیسے چراغ مفلس اک دم میں جل بجھا تو

خوبی یہی نہیں ہے کہ انداز و ناز ہو / معشوق کا ہے حسن اگر دل نواز ہو
ہے فرق ہی میں خیر نہ کر آرزوئے وصل / مل بیٹھئے جو اُس سے تو شکوہ دراز ہو
جوں توں کہ اس کی چاہ کا پردا کیا ہے میں / اے چشم گریہ ناک نہ افشائے راز ہو
ہم سے تو غیر عجز کبھو کچھ بنا نہ میر / خوشحال وہ فقیر کہ جو بے نیاز ہو

عشق کو نفع نہ بیتابی کرے ہے نہ شکیب / کریئے تدبیر جو یہ درد دوا رکھتا ہو
ہائے اِس زخمیِ شمشیرِ محبت کا جگر / درد کو اپنے جو ناچار چھپا رکھتا ہو
ایسے تو حال کے کہنے سے بھلی خاموشی / کہئے اُس سے جو کوئی اپنا کہا رکھتا ہو
گل ہو مہتاب ہو آئینہ ہو خورشید ہو میر / اپنا محبوب وہی ہے جو ادا رکھتا ہو

شیخ جی آؤ مصلّٰے گرِو جام کرو / جنسِ تقویٰ کے تئیں صرفِ مئے جام کرو

فرشِ مستاں کرو سجادۂ بے تہ کے تئیں / مے کی تعظیم کرو شیشے کا اکرام کرو
دامنِ پاک کو آلودہ رکھو بادے سے / آپ کو مغبچوں کے قابلِ دشنام کرو
نیک نامی و تقاوت کو دعا جلد کہو / دین و دل پیشکشِ سادۂ خود کام کرو
ننگ و ناموس سے اب گزرو جوانوں کی طرح / پرفشانی کرو اور ساقی سے ابرام کرو
اٹھ کھڑے ہو جو جھکے گردنِ مینائے شراب / خدمتِ بادہ گساراں ہی سرانجام کرو
خشکی اتنی بھی تو لازم نہیں اس موسم میں / پاسِ جوشِ گل و دل گرمیٔ ایام کرو
سایۂ گل میں لبِ جو پہ گلابی رکھو / ہاتھ میں جام کو لو آپ کو بدنام کرو
آہ تا چند رہو خانقہ و مسجد میں / ایک تو صبح گلستان میں بھی شام کرو
رات ساری تو گئی سنتے پریشاں گوئی / میر جی کوئی گھڑی تم بھی تو آرام کرو

ہیں کہاں مجھ سے وفا پیشہ نہ بیداد کرو / نہ کرو ایسا کہ پھر میرے تئیں یاد کرو
ایسے ہم پیشہ کہاں ہوتے ہیں اے غمزدگاں / مرگِ مجنوں پہ کڑھو ماتمِ فرہاد کرو
اے اسیرانِ تہِ دام نہ تڑپو اتنا / تا نہ بدنام کہیں چنگلِ صیاد کرو

صبح سے اور بھی پاتا ہوں اسے شام کو تند / کام کرتی ہے جو کچھ میری دعا مت پوچھو
ہوش و صبر و خرد و دین و حواس و دل و تاب / اس کے اک آنے میں کیا کیا نہ گیا مت پوچھو
وقتِ قتل آرزوئے دل جو لگے پوچھنے لوگ / میں اشارت کی ادھر اُن نے کہا مت پوچھو
خواہ مارا انہیں نے میر کو یا آپ موا / جانے دو یار جو ہونا تھا ہوا مت پوچھو

اس کی طرزِ نگاہ مت پوچھو / جی ہی جانے ہے آہ مت پوچھو
کہیں پہنچو گے بے رہی میں بھی / گمرہاں یوں یہ راہ مت پوچھو

تو گرفتارِ دامِ زلف اس کا
ہے یہی روسیاہ مت پوچھو

سائے میں ہر پلک کے خوابیدہ ہے قیامت
اس فتنۂ زماں کو کوئی جگا تو دیکھو
بلبل بھی گل گئی - پر مرکر چمن سے نکلی
اِس مرغِ شوق کش کی ٹک تم وفا تو دیکھو

ڈوبے ہے کشتی میری بحرِ عمیق غم میں
بیگانے سے کھڑے ہو تم آشنا تو دیکھو
آئے جو ہم تو اُن نے آنکھوں میں ہم کو رکھا
اہلِ ہوس سے کوئی اودھر کو جا تو دیکھو

یہی مشہور عالم ہیں دو عالم
خدا جانے ملاپ اُس سے کہاں ہو
جہاں سجدے میں ہم نے غش کیا تھا
وہیں شاید کہ اُس کا آستاں ہو
ہوئے ہم پیر سو ساکت ہیں اب میر
تمہاری بات کیا ہے تم جواں ہو

صحبت آخر ہے ہماری نہ کرو پھر افسوس
متصل ہو سکے تو ہم سے ملاقات کرو
بس بہت وقت گیا شعر کے فن میں ضائع
میر اب پیر ہوئے ترکِ خیالات کرو

مطرب نے پڑھی تھی غزل اک میر کی شب کو
مجلس میں بہت وجد کی حالت رہی سب کو
یہاں تئیں جب ہم نے تردد کئے ہیں تب
پہنچایا ہے آدم تئیں واعظ کے نسب کو
حیرت ہے کہ ہے مدعی معرفت اک خلق
کچھ ہم نے تو پایا نہیں اب تک ترے ڈھب کو
ہوگا کسو دیوار کے سائے میں پڑا میر
کیا کام محبت سے اُس آرام طلب کو

نہ تو طالع نہ جذب پھر دل کو
کس بھروسے پہ ٹک تحمل ہو

لگ نہ چل اے نسیم باغ کہ میں رہ گیا ہوں چراغ سا گل ہو
دیر رہنے کی جا نہیں یہ چمن بوئے گل ہو صفیر بلبل ہو
مجھ دوانے کی مت ہلا زنجیر کہیں ایسا نہ ہو کہ پھر غل ہو

مت تربتِ میر کو مٹاؤ رہنے دو غریب کا نشاں تو

ہو کوئی بادشاہ کوئی یاں وزیر ہو اپنی بلا سے بیٹھ رہے جب فقیر ہو
کس طرح آہ خاکِ مذلت سے میں اٹھوں افتادہ تر جو مجھ سے مرا دستگیر ہو
حد سے زیادہ جور و ستم خوشنما نہیں ایسا سلوک کر کہ تدارک پذیر ہو
دم بھر نہ ٹھیرے دل میں نہ آنکھوں میں ایک پل اتنے سے قد پہ تم بھی قیامت شریر ہو

اِک وقتِ خاص حق میں مرے کچھ دعا کرو تم بھی تو میر صاحب و قبلہ فقیر ہو

کیا کیا جوان ہم نے دنیا سے جاتے دیکھے اے عشق بے محابا دنیا ہو اور تو ہو
ایسے کہو گے کچھ تو ہم چپکے ہو رہینگے ہر بات پر کہاں تک آپس میں گفتگو ہو

جنبش بھی اُسکے آگے ہونٹوں کو ہو تو کہیو یوں اپنے طور پر تم باتیں بہت بنا لو
بازاری سارے دے ہی کہتے ہیں راہ بیٹھے جن کو ہمیں کہا ہے تم منہ سے مت نکالو

اِس باغ کے ہر گل سے چپک جاتی ہیں آنکھیں مشکل بنی ہے آن کے صاحب نظروں کو

کھینچا ہے آدمی نے بہت دور آپ کو — اس پردے میں خیال تو کر ٹک خدا نہ ہو

لطف شراب ابر سے ہے سو نصیب دیکھ — جب لیویں جام ہاتھ میں تب آفتاب ہو
ہستی پہ ایکدم کی تمہیں جوش اس قدر — اس بحر موج خیز میں تم تو حباب ہو

قتل کیئے پر غصہ کیا ہے لاش مری اٹھوانے دو — جان سے بھی ہم جاتے رہے ہیں تم بھی آؤ جانے دو
اب کے بہت ہے شور بہاراں ہم کو مت زنجیر کرو — دل کی ہوس ٹک ہم بھی نکالیں دھومیں ہمکو مچانے دو
عرصہ کتنا سارے جہاں کا وحشت پر جو آجائیں — پاؤں تو ہم پھیلا دینگے پر فرصت ہم کو پانے دو
ضعف بہت ہے میر تمہیں کچھ اسکی گلی میں مت جاؤ — صبر کرو ٹک اور بھی صاحب طاقت جی میں آنے دو
بات بنانا مشکل سا ہے شعر سبھی یاں کہتے ہیں — فکر بلند سے یارونکو اک ایسی غزل کہلانے دو

یارو دنیا میں رہو غمزدہ یا شاد رہو — ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو
ہم کو دیوانگی شہروں ہی میں خوش آتی ہے — دشت میں قیس رہو کوہ میں فرہاد رہو
وہ گراں خواب جو ہے ناز کا اپنے سو ہے — داد بیداد رہو شب کو کہ فریاد رہو
میر ہم مل کے بہت خوش ہوئے تم سے پیارے — اس خرابے میں مری جان تم آباد رہو

کہتا ہے کون میر کہ بے اختیار رو — ایسا تو رو کہ رونے پہ تیرے ہنسی نہ ہو
اے غافلان دہر یہ کچھ راہ کی ہے بات — چلنے کو قافلے ہیں یہاں تم رہے ہو سو

حاصل کوئی امید ہوئی ہو تو میں کہوں — خوں ہی ہوا کئے ہیں مرے دل میں سارے چاؤ

مار رکھا بیتابیِ دل نے ہم سب غم کے ماروں کو
کام کئے ہیں شوق سے ضایع صبر نہ آیا یاروں کو

جو نہ ہووے نماز کریئے نیاز
آدمی چاہیئے کرے کچھ تو
طالع و جذب وزاری و زر و زور
عشق میں چاہیئے ہے کچھ تو

کھلتا ہوں وہاں صحبتِ رندانہ جہاں ہو
میں خوش ہوں اسی شہر سے میخانہ جہاں ہو
رہنے سے مرے پاس کے بدنام ہوئے تم
اب جاکے رہو واں کہیں رسوا نہ جہاں ہو
ان اجڑی ہوئی بستیوں میں دل نہیں لگتا
ہے جی میں وہیں جا بسیں ویرانہ جہاں ہو
وحشت ہے خردمندوں کی صحبت سے مجھے میر
اب جا رہونگا واں کوئی دیوانہ جہاں ہو

اپنے حسنِ رفتنی پر آج مت مغرور ہو
پاس تو ہے جنکے وے ہی کل کہیں گے دور ہو
دیکھ کر وہ راہ چلتا ہی نہیں ٹک ورنہ ہم
پاؤں اسکے آنکھوں پر رکھ لیویں جو منظور ہو
شہرِ دل کی کیا خرابی کا بیاں باہم کریں
اِس کو ویرانہ نہ کہئے جو کچھو معمور ہو

صوفیاں خم وا ہوئے ہیں ہائے آنکھیں وا کرو
ابر آیا زور غیرت تم بھی ٹک پیدا کرو
مستی و دیوانگی کا عہد ہے بازار میں
پائے کوباں دست افشاں آن کر سودا کرو
گرچہ ہم پربستہ طائر ہیں پرے گلہائے تر
کچھ ہمیں پروا نہیں ہے تم اگر پیدا کرو

کرو مت درنگ اٹھتی اِس پینٹھ میں
چلو مول لو میر بازار کو

اگلے سب چاہتے تھے ہم سے وفاداروں کو
کچھ تمہیں پیار نہیں کرتے جفا ماروں کو

روز دفتر لکھے گئے یاں سے / اُن نے اک حرف بھی لکھا نہ کبھو
گو شگفتہ چمن چمن تھے گل / غنچۂ دل تو وا ہوا نہ کبھو
ابتدا ہی میں مر گئے سب یار / عشق کی پائی انتہا نہ کبھو

نہ سمجھا گیا کھیل قدرت کا ہم سے / کیا اس کو بد خو بنا کر نکورو
ہوا ابر و سبزے میں چشمک ہے گل کی / کریں ساز ہم برگِ عیشِ لبِ جو
بہار آئی گل پھول سر جوڑ نکلے / رہیں باغ میں کاش اس رنگ ہم تو
رہے آبرو میر تو ہے غنیمت / کہ غارت میں دل کی ہے ایمائے ابرو

آتا نہیں نظر کہ حصولِ امید ہو / کیا تھام تھام رکھئے دلِ بے قرار کو
جیتے رہے تو اس سے ہم آغوش ہونگے ہم / لبریز گل سے دیکھیں گے جیب و کنار کو
بولا کہ مجھ کو کرتی ہے بدنام گور میر / ہے خوب اگر مٹا دے کوئی اِس مزار کو

موسمِ ابر ہو سبو بھی ہو / گل ہو گلشن ہو اور تو بھی ہو
کب تک آئینے کا یہ حسن قبول / منہ ترا اس طرف کبھو بھی ہو
ہو جو تیرا سا رنگ گل کا ہے / دیکھیں ہم تب جب ایسی بو بھی ہو
ہے غرض عشق صرف ہی لیکن / شرط یہ ہے کہ جستجو بھی ہو
سرکشی گل کی خوش نہیں آتی / ناز کرنے کو ویسا رو بھی ہو
کس کو بلبل ہے دم کشی کا دماغ / ہو تو گل ہی کی گفتگو بھی ہو
دل تمنا کدہ تو ہے پر میر / ہو تو اس کی ہی آرزو بھی ہو

ردیف ہ

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم — اب جو ہیں خاک انتہا ہے یہ
بود آدم نمود شبنم ہے — ایک دو دم میں پھر ہوا ہے یہ
شکر اس کی جفا کا ہو نہ سکا — دل سے اپنے ہمیں گلا ہے یہ
شور سے اپنے حشر ہے پر وہ — یوں نہیں جانتا کہ کیا ہے یہ
دیکھ بیدم لگا مجھے کہنے — ہے تو مردہ سا پر بلا ہے یہ
میر کو کیوں نہ مغتنم جانے — اگلے لوگوں میں اک رہا ہے یہ

لکھ

ہم سے کچھ آگے زمانے میں ہوا کیا کیا کچھ — تو بھی ہم غافلوں نے آ کے کیا کیا کچھ
کیا کہوں تجھ سے کہ کیا دیکھا ہے تجھ میں میں نے — عشوہ و غمزہ و انداز و ادا کیا کیا کچھ
دل گیا ہوش گیا صبر گیا جی بھی گیا — شغل میں غم کے ترے ہم سے گیا کیا کیا کچھ
نام ہیں خستہ و آوارہ و بدنام مرے — ایک عالم نے غرض مجھ کو کہا کیا کیا کچھ
طرفہ صحبت ہے کہ سنتا نہیں تو ایک مری — واسطے تیرے سنا میں نے سنا کیا کیا کچھ
حسرتِ وصل و غمِ ہجر و خیالِ رخِ دوست — مر گیا میں پہ مرے جی میں رہا کیا کیا کچھ
دردِ دل زخمِ جگر کلفتِ غم داغِ فراق — آہ عالم سے مرے ساتھ چلا کیا کیا کچھ
چشمِ نمناک و دلِ پر جگرِ صد پارہ — دولتِ عشق سے ہم پاس بھی تھا کیا کیا کچھ
تجھ کو کیا بننے بگڑنے سے زمانے کے کہ یاں — خاک کن کن کی ہوئی صرف بنا کیا کیا کچھ
قبلہ و کعبہ خدا وند و ملاذ و مشفق — مضطرب ہو کے اُسے میں نے لکھا کیا کیا کچھ

پر کہوں کیا رقمِ شوق کی اپنے تاثیر
ہر سرِ حرف پہ وہ کہنے لگا کیا کیا کچھ

ایک محرم چلے میرؔ ہمیں عالم سے
درتہ عالم کو زمانے نے دیا کیا کیا کچھ

جی چاہے مل کسو سے یا سب سے تو جدا رہ
پر ہو سکے تو پیارے ٹک دل کا آشنا رہ

ہر مشت خاک یاں کی چاہے ہے اک تامل
بن سوچے راہ مت چل ہر گام پر کھڑا رہ

شاید کہ سربلندی ہووے نصیب تیرے
جوں گردِ راہ سب کے پاؤں سے تو لگا رہ

دوڑے بہت ولیکن مطلب کو کون پہنچا
آئندہ تو بھی ہم سا ہو کر شکستہ پا رہ

کیا موافق ہو دو اعشق کے بیمار کے ساتھ
جی ہی جاتے نظر آئے ہیں اس آزار کے ساتھ

رات مجلس میں تری ہم بھی کھڑے تھے جیسے
جیسے تصویر لگا دے کوئی دیوار کے ساتھ

دل کو ہر دم ہے لہو رونے کا ہجراں میں دماغ
دل کو اک ربط سا ہے دیدۂ خونبار کے ساتھ

بندے کے درد دل کو کوئی نہیں پہنچتا
ہر ایک بے حقیقت یاں ہے خدا رسیدہ

ذوق سخن ہوا ہے اب تو بہت ہمیں بھی
لکھ لیں گے میرؔ جی کے کچھ شعر چیدہ چیدہ

لطف کیا ہر کسو کی چاہ کے ساتھ
چاہ وہ ہے جو ہو نباہ کے ساتھ

کھینچتا ہے دلوں کو صحرا کچھ
ہے مزاجوں میں اپنے سودا کچھ

ویسے ظاہر کا لطف ہے چھپنا
کم تماشا نہیں یہ پردا کچھ

خلق کی کیا سمجھ میں وہ آیا
آپ سے تو گیا نہ سمجھا کچھ

کچھ نہ دیکھا تھا ہم نے پر تو بھی
آنکھ میں آئی ہے نہ دنیا کچھ

وصل اس کا خدا نصیب کرے
میر جی چاہتا ہے کیا کیا کچھ

بود نقش و نگار سا ہے کچھ
صورت اک اعتبار سا ہے کچھ
یہ جو مہلت جسے کہیں ہیں عمر
دیکھو تو انتظار سا ہے کچھ
ضعف پیری میں زندگانی بھی
دوش پر اپنے بار سا ہے کچھ
کیا ہے دیکھو ہو جو ادھر ہر دم
اور جیتوں میں پیار سا ہے کچھ

اِن اجڑی بستیوں میں دیوار و در ہیں کیا
آثار جنکے ہیں یہ ان کا نہیں اثر کچھ
واعظ نہ ہو معارض نیک و بد جہاں سے
جو ہو سکے تو غافل اپنا ہی فکر کر کچھ

یاروں کی آہ و زاری ہووے قبول کیونکر
اِن کی زباں میں کچھ ہے دلمیں ہے کچھ دعا کچھ

ہم جانتے تو عشق نہ کرتے کسو کے تھا
لیجاتے دل کو خاک میں اس آرزو کیتھا
نازاں ہوا سکے سامنے کیا گل کھلا ہوا
رکھتا ہے لطف ناز بھی روئے نکو کیتھا

گل گل شگفتہ مے سے ہوا ہے نگار دیکھ
یک جرعہ ہمدم اور پلا پھر بہار دیکھ

ملتا رہا کشادہ جبیں خوب و زشت سے
کیا آئینہ کرے ہے لبر یاں حیا کیساتھ
گو دستِ لطف سر سے اٹھالے کوئی شفیق
دل کا لگاؤ اپنا ہے دستِ دعا کے ساتھ
تدبیر دوستاں سے ہے بالعکس فائدہ
ہے دردِ عاشقی کو خصومت دوا کیساتھ
کیا جالوں میں چمن کو ولیکن قفس پہ میر
آتا ہے برگِ گل کبھو کوئی صبا کیساتھ

ردیف ی

خانۂ دل سے زینہار نجا — کوئی ایسے مکاں سے اٹھتا ہے
یوں اٹھے آہ اس گلی سے ہم — جیسے کوئی جہاں سے اٹھتا ہے

سینۂ مجروح بھی قابل ہوا ہے سیر کے — ایکدن تو آن کر یہ زخم سارے دیکھئے
خنجرِ بیداد کو کیا دیکھتے ہو دمبدم — چشم سے انصاف کی سینے ہمارے دیکھئے

سراپا آرزو ہونے نے بندہ کر دیا ہم کو — وگرنہ ہم خدا تھے گر دلِ بے مدعا ہوتے
فلک اے کاش ہمکو خاک ہی رکھتا کہ اسمیں ہم — غبارِ راہ ہوتے یا کسو کی خاک پا ہوتے
الٰہی کیسے ہوتے ہیں جنہیں ہے بندگی خواہش — ہمیں تو شرم دامنگیر ہوتی ہے خدا ہوتے

کبھو وادیٔ عشق دکھلائیے — بہت خضر بھی دل میں گمراہ ہے
جہاں سے تو رختِ اقامت کو باندھ — یہ منزل نہیں بے خبر راہ ہے

دل تسلی نہیں صبا ورنہ — جلوے سب ہینگے داغ میں گل کے
سیر کر میر اس چمن کی شتاب — ہے خزاں بھی سراغ میں گل کے

قابلِ آغوشِ ستمدیدگاں — اشک سا پاکیزہ گہر چاہئے

عشق کے آثار میں اے بوالہوس — داغ بدل دست لیسر چاہیئے
شرط سلیقہ ہے ہر اک امر میں — عیب بھی کرنے کو ہنر چاہیئے

ہستی اپنی حباب کی سی ہے — یہ نمائش سراب کی سی ہے
ناز کی اُس کے لب کی کیا کہئے — پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے
بار بار اُس کے در پہ جاتا ہوں — حالت اب اضطراب کی سی ہے
میں جو بولا کہا کہ یہ آواز — اُسی خانہ خراب کی سی ہے
میرؔ ان نیم باز آنکھوں میں — ساری مستی شراب کی سی ہے

اب جو اک حسرتِ جوانی ہے — عمر رفتہ کی یہ نشانی ہے
رشک یوسف ہے آہ وقت عزیز — عمر اک بار کاروانی ہے
گریہ ہر وقت کا نہیں بے ہیچ — دل میں کوئی غمِ نہانی ہے
اُس کی شمشیر تیز ہے ہمدم — مر رہیں گے جو زندگانی ہے

اُسکے ایفائے عہد تک نہ جیئے — عمر نے ہم سے بے وفائی کی
وصل کے دن کی آرزو ہی رہی — شب نہ آخر ہوئی جدائی کی

دل کی معموری کی مت کر فکر فرصت چاہیئے — ایسے ویرانے کے اب بسنے کو مدت چاہیئے
عافیت فرہاد مر کر کام اپنا کر گیا — آدمی ہووے کسی پیشے میں جرأت چاہیئے
ہو طرف مجھ پہلواں شاعر کا کب عاجز سخن — سامنے ہونے کو صاحب فن کے قدرت چاہیئے
عشق میں وصل و جدائی سے نہیں کچھ گفتگو — قرب و بعد اس جا برابر ہے محبت چاہیئے

تیری گلی سے جب ہم عزم سفر کریں گے — ہر ہر قدم کے اوپر پتھر جگر کریں گے
آزردہ خاطروں سے کیا فائدہ سخن کا — تم حرف سر کرو گے ہم گریہ سر کرینگے
اپنے بھی جی ہے آخر انصاف کر کہ کب تک — تو یہ ستم کرے گا ہم درگزر کریں گے
صناع طرفہ ہیں ہم عالم میں ریختے کے — جو میر جی لگے گا تو سب ہنر کریں گے

یاں سرکشاں جو صاحب تاج و لوا ہوئے — پامال ہو گئے تو نہ جانا کہ کیا ہوئے
دیکھی نہ ایک چشمک گل بھی چمن میں آہ — ہم آخر بہار قفس سے رہا ہوئے
پچھتاؤ گے بہت جو گئے ہم جہان سے — آدم کی قدر ہوتی ہے ظاہر جدا ہوئے
تجھ بن دماغ صحبت اہل چمن نہ تھا — گل وا ہوئے ہزار ولے ہم نہ وا ہوئے

کہاں ہیں آدمی عالم میں پیدا — خدائی صدقے کی انسان پر سے

خوب ہے اے ابر یک شب آؤ باہم روئیے — پر نہ اتنا بھی کہ ڈوبے شہر کم کم روئیے
وقت خوش دیکھا نہ اک دم سے زیادہ دہر میں — خندۂ صبح چمن پر مثل شبنم روئیے
شادی و غم میں جہاں کی ایک سے دس کا ہے فرق — عید کے دن ہنسئے تو دس دن محرم روئیے
دیکھا ماتم خانۂ عالم کو ہم مانند ابر — ہر جگہ پر جی میں یوں آیا دمادم روئیے
اب سے یوں کر دیئے مقرر اٹھے جب کہسار سے — وادی مجنوں پہ بھی اے ابر اک دم روئیے

برقعے کو اٹھا چہرے سے وہ بت اگر آوے — اللہ کی قدرت کا تماشا نظر آوے
اے ناقۂ لیلیٰ دو قدم راہ غلط کر — مجنون ز خود رفتہ کبھو راہ پر آوے

ممکن نہیں آرام دے بیتابیِ جگر کی
جب تک نہ پلک پر کوئی ٹکڑا نظر آوے

کہتے ہیں ترے کوچے سے میر آنے کہے ہے
جب جانئے وہ خانہ خراب اپنے گھر آوے

جب نام ترا لیجئے تب چشم بھر آوے
اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

صناع ہیں سب خوار از انجملہ ہنوں میں بھی
ہے عیب بڑا اس میں جسے کچھ نظر آوے

اے وہ کہ تو بیٹھا ہے سر راہ پہ زنہار
کہیو جو کبھو میر بلاکش ادھر آوے

مست دشتِ محبت میں قدم رکھ کہ خضر کو
ہر گام پہ اس رہ میں سفر سے حذر آوے

حرم کو جائیے یا دیر میں بسر کیجئے
تری تلاش میں اک دل کدھر کدھر کیجئے

کٹے ہے دیکھئے یوں عمر کب تلک اپنی
کہ سنئے نام ترا اور چشم تر کیجئے

ہوا ہے دن تو جدائی کا سو تعب سے شام
شبِ فراق کس امید پر سحر کیجئے

ہوں گرمِ سفر شامِ غریباں سے خوشی ہوں
اے صبحِ وطن تو تو مجھے بے وطنی ہے

ہر چند گدا ہوں میں ترے عشق میں لیکن
ان بوالہوسوں میں کوئی مجھ سا بھی غنی ہے

ہر اشک مرا ہے درِ شہوار سے بہتر
ہر لختِ جگر رشکِ عقیقِ یمنی ہے

اب کر کے فراموش تو ناشاد کرو گے
پر ہم جو نہ ہوں گے تو بہت یاد کرو گے

گر دیکھو گے تم طرزِ کلام اس کی نظر کر
اے اہلِ سخن میر کو استاد کرو گے

ایسی ہستی عدم میں داخل ہے
لے جواں ہم نہ طفلِ شیر ہوئے

ایکدم تھی نمود و بود اپنی
یا سفیدی کی یا اخیر ہوئے

یعنے مانند صبح دنیا میں
ہم جو پیدا ہوے سو پیر ہوئے
مت مل اہلِ دول کے لڑکوں سے
میر جی اِن سے مِل فقیر ہوئے

جبکہ پہلو سے یار اُٹھتا ہے
بے اختیار اُٹھتا ہے
اب تلک بھی مزارِ مجنوں سے
ناتواں اک غبار اُٹھتا ہے
ہے بگولا غبار کس کا میر
کہ جو ہو بے قرار اُٹھتا ہے

ایک سے ہے خرمنِ غم دانۂ اشک ایک سے
دیدہ و دل الغرض دونوں کا حاصل ایک ہے

ہم نے بھی سیر کی تھی چمن کی پر اے نسیم
اُٹھتے ہی آشیاں سے گرفتار ہو گئے

دل عجب جائے ہے ولیکن مفت
ہاتھ سے یہ مکان جاتا ہے
کیا خرابی ہے میکدے کی سہل
محتسب اک جہان جاتا ہے
اس سخن ناشنو سے کیا کہئے
غیر کی بات مان جاتا ہے

اے حسب جاہ والو جو آج تاجور ہے
کل اس کو دیکھیو تم نے تاج ہے نہ سر ہے
اسکے ہوائے گل میں سیرابی ہے نہایت
جوئے چمن پہ سبزہ مژگانِ چشم تر ہے
اے ہم صفیر بے گل کس کو دماغ نالہ
مدت ہوئی ہماری منقار زیر پر ہے
شمعِ اخیر شب ہوں سن سرگزشت میری
پھر صبح ہونے تک تو قصہ ہی مختصر ہے
اب رحم پر اسی کے موقوف ہے کہ یاں تو
نے اشک میں سرایت نے آہ میں اثر ہے
ہر دم قدم کو اپنے رکھ احتیاط سے یاں
یہ کارگاہ ساری دوکانِ شیشہ گر ہے

بحث ہے ناقصوں سے کاش فلک — مجھ کو اس زمرے سے نکال رکھے
سمجھے اندازِ شعر کو میرے — میرؔ کا سا اگر کمال رکھے

کچھ موج ہوا پیچاں اے میرؔ نظر آئی — شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی
دلی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصور تھے — جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

پھرتے پھرتے عاقبت آنکھیں ہماری مند گئیں — سو گئے بیہوش تھے ہم راہ کے ہارے ہوئے
پیار کرنے کا جو خوباں ہم پہ رکھتے ہیں گناہ — اُن سے بھی تو پوچھئے تم اتنے کیوں پیارے ہوئے

جرس راہ میں جملہ تن شور ہے — مگر قافلے سے کوئی دور ہے
تمنائے دل کے لئے جان دی — سلیقہ ہمارا تو مشہور ہے
دل اپنا نہایت ہے نازک مزاج — گر اگر یہ شیشہ تو پھر چور ہے
بہت سعی کریئے تو مر رہئے میرؔ — بس اپنا تو اتنا ہی مقدور ہے

گفتگو ریختے میں ہم سے نہ کر — یہ ہماری زبان ہے پیارے
شکلیں کیا کیا کیاں ہیں جن نے خاک — یہ وہی آسمان ہے پیارے
پھر تبسم کے کرنے سے تیرے — کنج لب پر گمان ہے پیارے
میرؔ عمداً بھی کوئی مرتا ہے — جان ہے تو جہان ہے پیارے

ہر قطعۂ چمن پر ٹک گاڑ کر نظر کر — بگڑیں ہزار شکلیں تب پھول کے بنائے

یک حرف کی بھی مہلت ہم کو نہ دی اجل نے
تھا جی میں آہ کیا کیا پر کچھ نہ کہنے پائے

آگے بھی تجھ سے تھا یاں تصویر کا سا عالم
بیدادیٔ فلک نے وے نقش سب مٹائے

اعجازِ عشق ہی سے جیتے رہے وگرنہ
کیا حوصلہ کہ جس میں آزار یہ سمائے

دل گرمیاں انہوں کی غیروں سے جب تب تھیں
مجلس میں جب گئے ہم غیرت نے جی جلائے

غالب کہ یہ دل خستہ شبِ ہجر میں مر جائے
یہ رات نہیں وہ جو کہانی میں گزر جائے

نا بیتکدہ ہے منزلِ مقصود نہ کعبہ
جو کوئی تلاشی ہو ترا آہ کدھر جائے

یاقوت کوئی ان کو کہے ہے کوئی گلبرگ
ٹک ہونٹ ہلا تو بھی کہ اک بات ٹھہر جائے

اس ورطے سے تختہ جو کوئی پہنچے کنارے
تو میرؔ وطن میرے بھی شاید یہ خبر جائے

ہو گئی شہر شہر رسوائی
اے مری موت تو بھلی آئی

یک بیاباں برنگِ صوتِ جرس
مجھ پہ ہے بیکسی و تنہائی

میرؔ جب سے گیا ہے دل تب سے
میں تو کچھ ہو گیا ہوں سودائی

میں نے اس قطعۂ صناع سے سر کھینچا ہے
کہ ہر اک کوچے میں جسکے تھے ہنر ور کتنے

تو ہے بیچارہ گدا میرؔ ترا کیا مذکور
مل گئے خاک میں یاں صاحبِ افسر کتنے

اے شبِ ہجر راست کہہ تجھ کو
بات کچھ صبح کی بھی آتی ہے

چشمِ بد دور چشمِ تر اے میرؔ
آنکھیں طوفان کو دکھاتی ہے

جیب اور آستیں سے رونے کا کام گزرا
سارا انچوڑ اب تو دامن پر آ رہا ہے

کاہے کا پاس اب تو رسوائی دور پہنچی — راز محبت اپنا کس سے چھپا رہا ہے

ترٹپنا بھی دیکھا نہ بسمل کا اپنے — میں کشتہ ہوں انداز قاتل کا اپنے
دلِ زخم خوردہ کے اور اک لگائی — مداوا کیا خوب گھائل کا اپنے
بنائیں رکھیں میں نے عالم میں کیا کیا — ہوں بندہ خیالات باطل کا اپنے

رات گزری ہے مجھے نزع میں روتے روتے — آنکھیں پھر جائیں گی اب صبح کے ہوتے ہوتے
کھول کر آنکھ اڑا دید جہاں کا غافل — خواب ہو جائے گا پھر جاگنا سوتے سوتے

اڑے خاک گاہے رہے گاہ ویراں — خراب و پریشاں یہاں کی طرح ہے
تعلق کرو میر اس پر جو چاہو — مری جان یہ کچھ جہاں کی طرح ہے

حصول کام کا دلخواہ یاں ہوا بھی ہے — سماجت اپنی بھی سب سے کوئی خدا بھی ہے
اداسیاں تھیں مری خانقہ میں قابلِ سیر — صنم کدے میں تو ٹک آکے دل لگا بھی ہے
یہ کہیے کیونکہ کہ خوباں سے کچھ نہیں مطلب — لگے جو پھرتے ہیں ہم کچھ تو مدعا بھی ہے
ترا ہے وہم کہ میں اپنے پیرہن میں ہوں — نگاہ غور سے کر مجھ میں کچھ رہا بھی ہے
گزار شہرِ وفا میں سمجھ کے کر مجنوں — کہ اس دیار میں میر شکستہ پا بھی ہے

صید افگنوں سے ملنے کی تدبیر کریں گے — اِس دل کے تئیں پیشکش تیر کریں گے
فریاد اسیرانِ محبت نہیں بے ہیچ — یہ نالے کسو دل میں بھی تاثیر کریں گے
دیوانگی کی شورشیں دکھلائیں گے بلبل — آتی ہے بہار اب ہمیں زنجیر کریں گے

وا اِس سے سرِ حرف تو ہو گو کہ یہ مرجائے | ہم حلق برید ہی سے تقریر کریں گے
رسوائی عاشق سے تسلی نہیں خوباں | مرجاوے گا تو نعش کو تشہیر کرینگے
یارب وہ بھی دن ہو گا کہ جو مصر سے چلکر | کنعاں کی طرف قافلے شبگیر کریں گے
بازیچہ نہیں میرؔ کے احوال کا لکھنا | اس قصے کو ہم کرتے ہی تحریر کریں گے

یہ جہل دیکھ کے ان سمجھے میں اٹھا لایا | گراں وہ بار جو تھا بیش اپنی طاقت سے
جو سوچے ٹک تو وہ مطلوب ہم ہی نکلے میرؔ | خراب پھرتے تھے جسکی طلب میں مدت سے

مرے خلق محوِ کلام سب مجھے چھوڑتے ہیں خموش کب
مرا حرف رشکِ کتاب ہے مری بات لکھنے کا باب ہے
جو وہ لکھتا کچھ بھی تو نامہ بر کوئی رہتی منہ میں تری زباں
تری خامشی سے یہ نکلے ہے کہ جوابِ خط کا جواب ہے
نہیں کھلتیں آنکھیں تمہاری ٹک کہ مآل پر بھی نظر کرو
یہ جو وہم کی سی نمود ہے اسے خوب دیکھو تو خواب ہے
گئے وقت آتے ہیں ہاتھ کب ہوئے ان کو گنو اکے خراب سب
تجھے کرنا ہوئے سو کر تو اب کہ یہ عمر برق شتاب ہے
کبھو لطف سے نہ سخن کیا کبھو بات کہہ نہ لگا لیا
یہی لحظہ لحظہ خطاب ہے وہی لحظہ لحظہ عتاب ہے
تو جہاں کے بحرِ عمیق میں سرِ پُر ہوا نہ بلند کر
کہ یہ پنج روزہ جو بود ہے کسو موج پر کا حباب ہے
رکھو آرزوئے خام کی کرو گفتگو خطِ جام کی

کہ سیاہ کاروں سے حشر میں نہ حساب ہے نہ کتاب ہے
مرا شور سن کے جو لوگوں نے کیا پوچھنا تو کہے ہے کیا
جسے میرؔ کہتے ہیں صاحبو یہ وہی تو خانہ خراب ہے

روشن ہے جلنے مرنا پروانے کا ولیکن
اے شمع کچھ تو کہہ تو تیری بھی تو زباں ہے
بھڑکے ہے آتش گل اے ابر تر ترحم
گوشے میں گلستاں کے میرا بھی آشیاں ہے
پیر مغاں! سعادت تیری جو ایسا آوے
یہ میرؔ میکشوں میں اِک طرز کا جواں ہے

دل کس طرح نہ کھینچیں اشعار ریختے کے
بہتر کیا ہے میں نے اِس عیب کو ہنر سے
انجام کار بلبل دیکھا ہم اپنی آنکھوں
آوارہ تھے چمن میں دو چار ٹوٹے پر سے
بے طاقتی نے دل کی آخر کو مار رکھا
آفت ہمارے جی کی آئی ہمارے گھر سے
دلکش یہ منزل آخر دیکھا تو راہ نکلی
سب یار جا چکے تھے آئے جو ہم سفر سے

ناصح کو خبر کیا ہے لذت سے غم دل کی
ہے حق بطرف اُس کے چکھے تو مزا جانے
بے طاقتیٔ دل نے ہم کو نہ کیا رسوا
ہے عشق سزا اس کو جو کوئی چھپا جانے

نالۂ عجز نقصِ اُلفت ہے
رنج و محنت کمال راحت ہے
تا دم مرگ غم خوشی کا نہیں
دلِ آزردہ گر سلامت ہے
تیرا شکوہ مجھے نہ میرا تجھے
چاہیئے یوں ہی جو فی الحقیقت ہے
تجھ کو مسجد ہے مجھ کو مے خانہ
واعظا اپنی اپنی قسمت ہے
تربتِ میرؔ پر ہیں اہلِ سخن
ہر طرف حرف ہے حکایت ہے

تو بھی تقریب فاتحہ سے چل | بجد اواجب الزیارت ہے

سچ پوچھو تو کب ہے گا اُس کا سا دہن غنچہ | تسکیں کے لئے ہم نے اک بات بنائی ہے

میر میں جیتوں میں آؤں گا آئی ان جس دن | دل نہ تڑپے گا مرا چشم نہ بھر آئیگی

اس فن میں کوئی بے تہ کیا ہو مرا معارض | اول تو میں سند ہوں پھر یہ مری زباں ہے

طرف ہونا مِرا مشکل ہے میر اس شعر کے فن میں | یونہی سودا کبھو ہوتا ہے سو جاہل ہے کیا جانے

کیا کروں شرح خستہ جانی کی | میں نے مر مر کے زندگانی کی
حال بد گفتنی نہیں میرا | تم نے پوچھا تو مہربانی کی
سب کو جانا ہے یوں تو پر اے صبر | آتی ہے اک تری جوانی کی
بیت بحثی سمجھ کے کر بلبل | دھوم ہے میری خوش زبانی کی
جس سے کھوئی تھی نیند میر نے کل | ابتدا پھر وہی کہانی کی

کچھ تو کہہ وصل کی پھر رات چلی جاتی ہے | دن گزر جائیں ہیں پر بات چلی جاتی ہے
رہ گئے گاہ تبسم پہ گہے بات ہی پر | بارے اے ہمنشیں اوقات چلی جاتی ہے
روز آنے پہ نہیں نسبتِ عشقی موقوف | عمر بھر ایک ملاقات چلی جاتی ہے
خرقہ مندیل و ردا مست لیے جاتے ہیں | شیخ کی ساری کرامات چلی جاتی ہے

تم نے جو اپنے دل سے بھلایا ہمیں تو کیا
اپنے تئیں تو دل سے ہمارے بھلائیے

پہنچا تو ہوگا سمع مبارک میں حالِ میر
اِس پر بھی جی میں آوے تو دل کو لگائیے

خالقہ کا تو نہ کر قصد ٹک اے خانہ خراب
یہی اِک رہ گئی ہے بستی مسلمانوں کی

دل و دیں کیسے کہ اُس رہزنِ دلہا سے آب
یہ پڑی ہے کہ خدا خیر کرے جانوں کی

سرگزشتیں نہ مری سُن کہ اُچٹتی ہے نیند
خاصیّت یہ ہے مری جان اِن افسانوں کی

میکدے سے تو ابھی آیا ہے مسجد میں میر
ہو نہ لغزش کہیں مجلس ہے یہ بیگانوں کی

نہیں وسواس جی گنوانے کے
ہائے رے ذوق دل لگانے کے

میری تغیّرِ حال پر مت جا
اتفاقات ہیں زمانے کے

دمِ آخر ہی کیا نہ آنا تھا
اور بھی وقت تھے بہانے کے

اس کدورت کو ہم سمجھتے ہیں
ڈھب ہیں یہ خاک میں ملانے کے

دل و دیں ہوش و صبر سب ہی گئے
آگے آگے تمہارے آنے کے

رہی نہ گفتہ مرے دل میں داستاں میری
نہ اِس دیار میں سمجھا کوئی زباں میری

برنگ صوتِ جرس تجھ سے دور ہوں تنہا
خبر نہیں ہے تجھے آہ کارواں میری

ترے نہ آج کے آنے میں صبح کے مجھ پاس
ہزار جائے گئی طبع بدگماں میری

شب اسکے کوچے میں جاتا ہوں اس توقع پر
کہ ایک دوست ہے واں خواب پاسباں میری

اُسی سے دور رہا اصلِ مدعا جو تھا
گئی یہ عمر عزیز آہ رائیگاں میری

ترے فراق میں جیسے خیال مفلس کا
گئی ہے فکرِ پریشاں کہاں کہاں میری

دل کو مت بھول جانا میرے بعد
مجھ سے یہ یادگار رہتا ہے
دور میں چشمِ مست کے تیری
فتنہ بھی ہوشیار رہتا ہے

آجکل بے قرار ہیں ہم بھی
بیٹھ جا چلنے ہار ہیں ہم بھی
آن میں کچھ ہیں آن میں کچھ ہیں
تحفۂ روزگار ہیں ہم بھی
منع گریہ نہ کر تو اے ناصح
اس میں بے اختیار ہیں ہم بھی

غفلت میں گئی آہ مری ساری جوانی
اے عمرِ گزشتہ میں تری قدر نہ جانی
دیکھیں تو سہی کب تئیں نبھتی ہے یہ صحبت
ہم جی سے ترے دوست ہیں تو دشمنِ جانی
اک شخص مجھی سا تھا کہ وہ تجھ پہ تھا عاشق
وہ اس کی وفا پیشگی وہ اس کی جوانی
یہ کہہ کے جو رویا تو لگا کہنے نہ کہہ پھر
سنتا نہیں میں ظلم رسیدوں کی کہانی

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے
وہ کیا چیز ہے آہ جس کے لئے
ہر اک چیز سے دل اٹھا کر چلے
کوئی ناامیدانہ کر کے نگاہ
سو تم ہم سے منہ بھی چھپا کر چلے
دکھائی دیئے یوں کہ بے خود کیا
ہمیں آپ سے بھی جدا کر چلے
جبیں سجدے کرتے ہی کرتے گئی
حقِ بندگی ہم ادا کر چلے
پرستش کی یاں تک کہ اے بت تجھے
نظر میں سبھوں کی خدا کر چلے
گئی عمر در بندِ فکرِ غزل
سو اس فن کو ایسا بڑا کر چلے
کہیں کیا جو پوچھے کوئی ہم سے میرؔ
جہاں میں تم آئے تھے کیا کر چلے

کل بارے ہم سے اُس سے ملاقات ہو گئی　　دو دو بچن کے ہونے میں اک بات ہو گئی
ڈر ظلم سے کہ اِس کی جزا بس شتاب ہے　　آیا عمل میں یاں کہ مکافات ہو گئی
خورشید سا پیالہ مے بے طلب دیا　　پیر مغاں سے رات کرامات ہو گئی
اپنے تو ہونٹ بھی نہ ہلے اسکے روبرو　　رنجش کی وجہ میر وہ کیا بات ہو گئی

کوئی ہو محرمِ شوخی ترا تو میں پوچھوں　　کہ بزمِ عیش جہاں کیا سمجھکے برہم کی

جس جگہ دورِ جام ہوتا ہے　　واں یہ عاجز مدام ہوتا ہے
ہم تو اِک حرف کے نہیں ممنوں　　کیسا خط و پیام ہوتا ہے
پوچھ مت آہ عاشقوں کی معاش　　روز اُن کا بھی شام ہوتا ہے
زخم بن غم بن اور غصے بن　　اپنا کھانا حرام ہوتا ہے
میر صاحب بھی اسکے ہاں تھے پر　　جیسے کوئی غلام ہوتا ہے

حسرت لطف عزیزانِ چمن جی میں رہی　　سر پہ دیکھا نہ گل و سرو کا سایا ہم نے
بعد اک عمر کہیں تم کو جو تنہا پایا　　ڈرتے ڈرتے ہی کچھ احوال سنایا ہم نے
یاں فقط ریختہ ہی کہنے نہ آئے تھے ہم　　چار دن یہ بھی تماشا سا دکھایا ہم نے

نسبت تو دیتے ہیں ترے لب سے پر ایکدن　　ناموس یوں ہی جائے گی آبِ حیات کی
صد حرف زیر خاک تہ دل چلے گئے　　مہلت نہ دی اجل نے ہمیں یک بات کی
ہم تو ہی اِس زمانے میں حیرت سے چپ نہیں　　اب بات جا چکی ہے سبھی کائنات کی

کرو توکل کہ عاشقی میں نہ یوں کرو گے تو کیا کرو گے
الم جو یہ ہے تو دردمندو! کہاں تلک تم دوا کرو گے
جگر میں طاقت کہاں ہے اتنی کہ درد ہجراں سے مرتے رہیے
ہزاروں وعدے وصال کے تھے کوئی بھی جیتے وفا کرو گے
اخیر الفت یہی نہیں ہے کہ جل کے آخر ہوئے پتنگے
ہوا جو یاں کی یہ ہے تو یارو غبار ہو کر اڑا کرو گے

مصائب اور تھے پر دل کا جانا — عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے
سرہانے میر کے کوئی نہ بولو — ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

عمر بھر ہم رہے شرابی سے — دل پر خوں کی اک گلابی سے
کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے — اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے
کام تھے عشق میں بہت پر میر — ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے

ہر کوئی اس مقام پر دس روز — اپنی نوبت بجائے جاتا ہے
جائے عبرت ہے خاکدان جہاں — تو کہاں منہ اٹھائے جاتا ہے
دیکھ سیلاب اس بیاباں کا — کیسا سر کو جھکائے جاتا ہے

کعبے میں جاں بلب تھے ہم دوری بتاں سے — آئے ہیں پھر کے یارو اب کے خدا کے ہاں سے
جب کوندتی ہے بجلی تب جانب گلستاں — رکھتی ہے چھیڑ میرے خاشاک آشیاں سے
کیا خوبی اسکے منہ کی اے غنچہ نقل کریے — تو تو نہ بول ظالم بو آتی ہے دہاں سے

خاموشی ہی میں ہم نے دیکھی ہے مصلحت اب — ہر اک سے حال دل کا مدت کہا زباں سے
اتنی بھی بد مزاجی ہر لحظہ میر تم کو — الجھاؤ ہے زمیں سے جھگڑا ہے آسماں سے

ہم گو نہ ہوں جہاں میں آخر جہاں تو ہو گا — تو نے بدی تو کی ہے ظالم بھلا کیا ہے

گرداب وار یار ترے صدقے جائیے — دریا کا پھیر پائیے تیرا نہ پائیے

جو کفر جانتے تھے عشق بتاں کو وہ ہی — مسجد کے آگے آخر قشقہ لگا کے بیٹھے
کیا اپنی اور اس کی اب نقل کریئے صحبت — مجلس سے اٹھ گیا وہ ٹک ہم جو آکے بیٹھے

شاید اب ٹکڑ دل نے دیکھے قصد آنکھوں کا کیا — کچھ سبب تو ہے جو آنسو آتے آتے تھم گئے
کیا معاش اس غمکدے میں ہمنے دس دن کی بہم — اٹھ کے جس کے ہاں گئے دل کالئے ماتم گئے
ربط صاحب خانہ سے مطلق بہم پہنچا نہ میر — مدتوں سے ہم حرم میں تھے پہ نامحرم گئے

تم چھیڑتے ہو بزم میں مجھ کو تو ہنسی سے — پر مجھ پہ جو ہو جائے ہے پوچھو مرے جی سے

کیا رنگ و بو و بادِ سحر سب ہیں گرم راہ — کیا ہے جو اس چمن میں ہے ایسی چلا چلی

تم نہیں فتنہ ساز سچ صاحب — شہر پر شور اس غلام سے ہے
کوئی تجھ سا بھی کاش تجھ کو ملے — مدعا ہم کو انتقام سے ہے
شعر میرے ہیں سب خواص پسند — پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

سہل ہے میر کا سمجھنا کیا ہر سخن اس کا اک مقام سے ہے

وہ جو پھرتا ہے مجھ سے دور ہی دور ہے یہ تقریب جی کے جانے کی

کس کو کہتے ہیں نہیں میں جانتا اسلام و کفر دیر ہو یا کعبہ مطلب مجھ کو تیرے در سے ہے
رحم بھی دنیا تھا تھوڑا ہائے اس خوبی کے ساتھ تجھ سے کیا کل گفتگو یہ داور محشر سے ہے
کیا کروں گا لے کے میں بے پر ہوس گلزار کی لطف گلگشت اے نسیم صبح بال و پر سے ہے

چھاتی جلا کرے ہے سوز دروں بلا ہے اک آگ سی رہے ہے کیا جانئے کہ کیا ہے
میں اور تو ہیں دونوں مجبور طور اپنے پیشہ ترا جفا ہے شیوہ مرا وفا ہے
روئے سخن ہے کیدھر اہل جہاں کا یارب سب متفق ہیں اس پر ہر ایک کا خدا ہے
پھرتے ہو میر صاحب سب سے جدے جدے تم شاید کہیں تمہارا دل ان دنوں لگا ہے

اس شوخ ستمگر کو کیا کوئی کھلا چاہے جو چاہنے والے کا ہر طور برا چاہے
کعبے گئے کیا کوئی مقصد کو پہنچتا ہے کیا سعی سے ہوتا ہے جب تک نہ خدا چاہے
دل جانے ہے جوں رو کر شبنم نے کہا گل سے اب ہم تو چلے یاں سے رہ تو جو رہا چاہے

ہم طور عشق سے تو واقف نہیں ہیں لیکن سینے میں جیسے دل کو کوئی ملا کرے ہے
کیا کشتۂ داغ دل ہے ٹکڑے جگر ہے سارا جانے وہی جو کوئی ظالم وفا کرے ہے

یار بن تلخ زندگانی تھی دوستی مدعی جانی تھی

لطف پر اس کے ہمنشیں مت جا   کبھو ہم پر بھی مہربانی تھی
شیب میں فائدہ تامل کا   سوچنا تب تھا جب جوانی تھی
میرے قصے سے سب کی نیندیں گئیں   کچھ عجب طور کی کہانی تھی
عاشقی جی ہی لے گئی آخر   یہ بلا کوئی ناگہانی تھی
کوئے قاتل سے بچکے نکلا خضر   اسی میں اس کی زندگانی تھی
فقر پہ بھی تھا میر کے اک رنگ   کفنی پہنی سو زعفرانی تھی

جفا اس کی نہ پہنچی انتہا کو   دریغا عمر کی بے وفائی

سارے دکھوں کی اے دل ہو جائیگی تلافی   صحبت ہماری اسکی ٹک بھی اگر بنے ہے
برسوں لگی ہوئی ہیں جب مہر و مہ کی آنکھیں   تب کوئی ہم سا صاحب صاحب نظر بنے ہے
یارانِ دیر و کعبہ دونوں بلا رہے ہیں   اب دیکھیں میر اپنا جانا کدھر بنے ہے

میر دریا ہے سنے شعر زبانی اس کی   اللہ اللہ رے طبیعت کی روانی اسکی
ایک ہے عہد میں اپنے وہ پراگندہ مزاج   اپنی آنکھوں میں نہ آیا کوئی ثانی اسکی
مینہ تو بوچھار کا دیکھا ہے برستے تم نے   اسی انداز سے تھی اشک فشانی اسکی
بات کی طرز کو دیکھو تو کوئی جادو تھا   پر ملی خاک میں کیا سحر بیانی اسکی
اس کا وہ عجز تمہارا یہ غرور خوبی   منتیں ان نے بہت کیں پہ نہ مانی اسکی
سرگزشت آپ ہی کس اندوہ سے کہتا تھا   سو گئے تم نہ سنی ہائے کہانی اسکی
مرثیے دل کے کئی کہہ کے دیئے لوگوں کو   شہر دلی میں ہے سب پاس نشانی اسکی
آبلے کی سی طرح ٹھیس لگی پھوٹ بہے   دردمندی میں گئی ساری جوانی اسکی

اب گئے اسکے جز افسوس نہیں کچھ حاصل
حیف صد حیف کہ کچھ قدر نہ جانی اس کی

مزاجوں میں یاس آگئی ہے ہمارے
نہ مرنے کا غم ہے نہ جینے کی شادی

باؤلے سے جب تلک بکتے تھے سب کہتے تھے یہ
عقل کی باتیں کیاں کیا ہم سے نادانی ہوئی

مقدور تک تو ضبط کروں ہوں پہ کیا کروں
منہ سے نکل ہی جاتی ہے اک بات پیار کی

تھا مشک جنکے زیرِ نگیں صاف مٹ گئے
تم اس خیال میں ہو کہ نام و نشاں رہے

جو خواہش نہ ہوتی تو کاہش نہ ہوتی
ہمیں جی سے مارا تری آرزو نے
نہ بھائیں تجھے میری باتیں وگرنہ
رکھی دھوم شہروں میں اس گفتگو نے
وہ کسریٰ کہ ہے شور جس کا جہاں میں
پڑے ہینگے اسکے محل آج سونے
تری چال ٹیڑھی تری بات روکھی
تجھے میر سمجھا ہے یاں کم کسو نے

نوگرفتار ہوں اس باغ کا رحم اے صیاد
موسمِ گل رہے جب تک مجھے مہلت دیجے
اپنے ہی دل کا گنہہ ہے جو جلاتا ہے مجھے
کس کو لے مریئے میاں اور کسے تہمت دیجے

مرگِ مجنوں سے عقل گم ہے میر
کیا دوانے نے موت پائی ہے

ہر طرف عجلت تجھ سے ہے اے عشق
شکر تیرا تری شکایت ہے

منت مراعاتِ غیر رکھ منظور — میر کے حق میں یہی رعایت ہے

سر کسو سے فرو نہیں ہوتا — حیف بندے ہوئے خدا نہ ہوئے

جی کے لگنے کی میر کچھ کہہ بھی — ہے وہی بات جس میں ہو یہ بھی
حسن اے رشکِ مہ نہیں رہتا — چار دن کی ہے چاندنی یہ بھی

کرتی پھرے ہے رسوا سارے چمن میں مجھکو — گر کوئی بات دل کی بلبل سے میں کہی ہے
ہے صبح کا سا عرصہ پیری کا اسمیں کیا ہو — باقی ہے وقت کتنا فرصت کہاں ہی ہے
چلّاہٹ اس طرح کی جز میر کس سے ہووے — باور نہیں تو دیکھو یہ ہو نہ ہو وہی ہے

اس کا غضب سے نامہ نہ لکھنا تو سہل ہے — لوگوں کے پوچھنے کا کوئی کیا جواب دے

نقدِ دل غفلت سے کھو یارہ کھوٹی کر گئے — کارواں جاتا رہا ہم خواب ہی میں مر گئے
کیا کہیں اس نے جو پھیرا اپنے در سے ہمیں — مر گئے غیرت سے ہم بھی پر نہ اُس کے گھر گئے
واعظِ ناکس کی باتوں پر کوئی جاتا ہے میر — آؤ میخانے چلو تم کس کے کہنے پر گئے

اے کاش کوئی جا کر کہہ آوے یار سے بھی — یاں کام جا چکا ہے اب اختیار سے بھی
جان و جہاں سے گزرا میں میر جنکی خاطر — بچکر نکلتے ہیں وے میر مزار سے بھی

حرف شنو ساتھ اپنے نہیں ہیں ورنہ درائے قافلہ ساں — راہ میں باتیں کس کس ڈھب کی کرتے ہیں ہم یادوں سے

خستہ ہو اپنا کیسا ہی کوئی پھر بھی گلے سے لگاتے ہیں وحشت ایک تمہیں کو دیکھی اپنے سینہ فگاروں سے

کچھ نہیں اور دیکھیں ہیں کیا کیا خواب کا سا ہے یاں کا عالم بھی

باغ میں سیر کبھو ہم بھی کیا کرتے تھے روشِ آبِ رواں پھیلے پھرا کرتے تھے
غیرتِ عشق کسو وقت بلا تھی ہم کو تھوڑی آزردگی میں ترکِ وفا کرتے تھے
دل کی بیماری سے خاطر تو ہماری تھی جمع لوگ کچھ یوں ہی محبت سے دوا کرتے تھے
جب تلک شرم رہی مانع شوخی اس کی تب تلک ہم بھی ستم دیدہ حیا کرتے تھے
مائل کفر جوانی میں بہت تھے ہم لوگ دیر میں مسجدوں میں دیر رہا کرتے تھے
اب تو بیتابئ دل نے ہمیں بہلا ہی دیا آگے رنج و تعب عشق اٹھا کرتے تھے
اٹھ گئے پر مرے تکیے کو کہینگے یاں میر درد دل بیٹھے کہانی سی کہا کرتے تھے

دنیا کی قدر کیا جو طلبگار ہو کوئی کچھ چیز مال ہو تو خریدار ہو کوئی
کیا ابرِ رحمت اسلیے برسا ہے لطف سے طاعت گزیں جو ہو سو گنہگار ہو کوئی
ہم عاشقانِ زرد و زبون و نزار سے مت کر ادائیں ایسی کہ بیزار ہو کوئی

چلو چمن میں جو دل کھلے ٹک ہم غم دل کہا کرینگے طیور ہی سے بکا کرینگے گلوں کے آگے بکا کرینگے

سنو سرگزشت اب ہماری زبانی سنی گرچہ جاتی نہیں یہ کہانی
ملا دیتی ہے خاک میں آدمی کو محبت ہے کوئی بلا آسمانی
گرامی گہر میر جی تھا ہمارا دلے عشق میں قدر ہم نے نجانی

چلتے ہو تو چمن کو چلیئے سنتے ہیں کہ بہاراں ہے
پات ہرے ہیں پھول کھلے ہیں کم کم بادو باراں ہے

آگے کسو کے کیا کریں دستِ طمع دراز
وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے

اڑنے کی یک ہوس ہے ہم کو قفس سے ورنہ
شائستہ پر یدن بازو میں پر کہاں ہے

فرہاد و قیس گزرے اب شور ہے ہمارا
ہر کوئی اپنی نوبت دو دن بجا گیا ہے

اے میر شعر کہنا کیا ہے کمال انساں
یہ بھی خیال سا کچھ خاطر میں آ گیا ہے
شاعر نہیں جو دیکھا تو تو ہے کوئی ساحر
دو چار شعر پڑھ کر سب کو رجھا گیا ہے

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

دل کی بات کہی نہیں جاتی چپکے رہنا ٹھانا ہے
حال اگر ہے ایسا ہی تو جی سے جانا جانا ہے

فرصت کم ہے یاں رہنے کی بات نہیں کچھ کہنے کی
آنکھیں کھول کے کان جو کھولو بزمِ جہاں افسانا ہے

فائدہ ہو گا کیا مترتب ناصح ہرزہ درائی سے
کس کی نصیحت کو ن سنے ہے عاشق تو دیوانا ہے

تیغ تلے ہی اُس کے کیوں نہ گردن ڈال کے جا بیٹھیں
سر تو آخر کار ہمیں بھی خاک کے اُوپر جھکانا ہے

میں اس کی جُدائی میں تصدیع بہت پائی — درویشی و کم پائی بے صبری و تنہائی
تھا صبر و سکوں جبتک رہتا تھا مجھے غش سا — بیتابیٔ دل سر پر اک اور بلا لائی

بُوئے گُل یا نوائے بلبل تھی — عمر افسوس کیا شتاب گئی
مجھ کو مارا بھلا کیا تو نے — پر وفا کا بُرا کیا تو نے
حسرتیں اس کی سر پٹکتی ہیں — مرگِ فرہاد کیا کیا تو نے

آنکھوں کی طرف گوش کی در پردہ نظر ہے — کچھ یار کے آنے کی مگر گرم خبر ہے
یہ راہ روش سروِ گلستاں میں نہ ہو گی — اس قامتِ دل چسپ کا انداز دگر ہے
یہ بادیۂ عشق ہے البتہ ادھر سے — بچکر نکل اے سیل کہ یاں شیر کا ڈر ہے
وہ ناوکِ دل دوز ہے لاگو مرے جی کا — تو سامنے ہو ہمدم اگر تجھ کو جگر ہے
کیا جان کہ جس کے لئے منہ موڑیئے تم سے — تم آؤ چلے داعیہ کچھ تم کو اگر ہے
شب شور و فغاں کرتے گئی مجھ کو تو اب تو — دلکش ہو ٹک اے مرغِ چمن وقتِ سحر ہے
سوچے تھے کہ سودائے محبت میں ہے کچھ سود — اب دیکھتے ہیں اس میں تو جی ہی کا ضرر ہے
شانے پہ رکھا ہار جو پھولوں کا تو لچکے — کیا ساتھ نزاکت کے رگِ گل سی کمر ہے
کر کام کسو دل میں گئی عرش پہ تو کیا — اے آہ سحر گاہ اگر تجھ میں اثر ہے
ہر بیت میں کیا میر تری باتیں گھٹی ہیں — کچھ اور سخن کر کہ غزل سلک گہر ہے

کیا خانہ خرابی کا ہمیں خوف و خطر ہے — گھر ہے کسو گوشے میں تو مکڑی کا سا گھر ہے
اے شمع اقامت کدۂ اس بزم کو مت جان — روشن ہے ترے چہرے سے تو گرم سفر ہے
اس عاشقِ دیوانہ کی مت پوچھ معیشت — دنداں بجگر دست بدل داغ بسر ہے

کیا آگ کی چنگاریاں سینے میں بھریں ہیں — جو آنسو مری آنکھ سے گرتا ہے شرر ہے
ڈر جان کا جس جا ہے وہیں گھر بھی ہے اپنا — ہم خانہ خرابوں کو نہ یاں گھر ہے نہ در ہے

بزم میں سے اب تو چل اے رشکِ صبح — شمع کے اوپر پھری ہے مردنی
میں چراغِ صبحگاہی ہوں نسیم — مجھ سے اکدم کے لئے کیا دشمنی

نہ بک شیخ اتنا بھی واہی تباہی — کہاں رحمتِ حق کہاں بیگناہی
مجھے میر ناگور کا ندھا دیا تھا — تمنائے دل نے تو یا نتک تباہی

پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے — جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے
مہر و وفا و لطف و عنایت ایک سے واقف نہیں ہے — اور تو سب کچھ طنز و کنایہ رمز و اشارہ جانے ہے

ملوان دنوں ہم سے اک رات جانی — کہاں ہم کہاں تم کہاں پھر جوانی
شکایت کروں ہوں تو سونے لگے ہے — مری سرگزشت اب ہوئی ہے کہانی
ادا کھینچ سکتا ہے بہزاد اس کی — کھنچے صورت ایسی تو یہ ہم نے مانی
ملاقات ہوتی ہے تو کشمکش سے — یہی ہمسے ہے جب نہ تب اینچا تانی

عالم عالم عشق و جنوں ہے دنیا دنیا تہمت ہے — دریا دریا روتا ہوں میں صحرا صحرا وحشت ہے
ہائے غیوری جسکی دیکھی جی ہی نکلتا ہے اپنا — دیکھتے اسکی اور نہیں پھر عشق کی یہ بھی غیرت ہے
صبح سے آنسو نومیدانہ جیسے وداعی آتا تھا — آج کسو خواہش کی شاید دل سے ہمارے رخصت ہے
کیا دلکش ہے بزم جہاں کی جاتے یاں سے جسے دیکھو — وہ عمدیدہ رنج کشیدہ آہ سراپا حسرت ہے

آبِحیات وہی نہ جس پر خضر و سکندر مرتے رہے ۔۔۔ خاک سے ہم نے بھرا وہ چشمہ یہ بھی ہماری ہمت ہے

گلستاں کے ہیں دونوں پلّے بھرے ۔۔۔ بہار اس طرف اُس طرف ابر ہے
درِ کعبہ پر کفر بکتا ہے میر ۔۔۔ مسلماں نہیں وہ کہیں گبر ہے

اپنے نیاز تم سے اب تک بتاں رہے تھے ۔۔۔ تم ہو خدائے باطل ہم بندے ہیں تمہارے
ٹھہرے ہیں ہم تو مجرم ٹک پیار کرکے تم کو ۔۔۔ تم سے بھی کوئی پوچھے تم کیوں ہوئے پیارے
کل میں جو سیر میں تھا کیا پھول پھول بیٹھے ۔۔۔ بلبل نے لی ہے گویا گلزار سب اجارے
کرتا ہے ابرِ نیساں پر دُر دہن صدف کا ۔۔۔ منہ جو کوئی لیا رے ایسے کئے لیا رے
ہوتی ہے صبح جویاں ہے شام سے بھی بدتر ۔۔۔ کیا کہئے میر خوبی ایام کی ہمارے

داد فریاد جا بجا کریئے ۔۔۔ شاید اسکے بھی دل میں جا کریئے
دیکھیں کب تک رہے ہے یہ صحبت ۔۔۔ گالیاں کھایئے دعا کریئے
کچھ کہیں تو کہے ہے یہ نہ کہو ۔۔۔ کیونکر اظہارِ مدعا کریئے
راہ تکنے کو بھی نہایت ہے ۔۔۔ منتظر کب تلک رہا کریئے
ہستی موہوم دیک سر و گردن ۔۔۔ سیکڑوں کیونکہ حق ادا کریئے
وہ نہیں سرگزشت سنتا میر ۔۔۔ یوں کہانی سی کیا کہا کریئے
مترتب ہو نفع جو کچھ بھی ۔۔۔ دل کی بیماری کی دوا کریئے

نالہ جب گرم کار ہوتا ہے ۔۔۔ دل کلیجے کے پار ہوتا ہے
سب مزے درکنار عالم کے ۔۔۔ یار جب ہم کنار ہوتا ہے

جبر ہے قہر ہے قیامت ہے — دل جو بے اختیار ہوتا ہے

اس صنایع کا اِس بدائع کا — کچھ تعجب نہیں خدائی ہے
نہ تو جذب رسا نہ بخت رسا — کیونکہ کہئے کہ واں رسائی ہے
میں نہ آتا تھا باغ میں اُس بن — مجھ کو بلبل پکار لائی ہے
گل قفس تک نسیم لائی ہے — لوکہ پھر کر بہار آئی ہے
عشق دریا ہے ایک لنگر دار — تہ کسو نے بھی اِسکی پائی ہے
وہ نہ شرماوے کب تلک آخر — دوستی یاری آشنائی ہے
وے نہیں تو اُنہوں کا بھائی اور — عشق کرنے کی کیا منائی ہے

یارب کوئی دیوانہ بے ڈھنگ سا آجاوے — اغلال و سلاسل ٹک اپنی بھی ہلا جاوے
خاموش رہیں کبتک نادانِ جہاں میں ہم — ہنگامہ قیامت کا شورش سے اُٹھا جاوے
عاشق میں ہے اور اسمیں نسبت سگ و آہو کی — جُوں جُوں ہو رمیدہ وہ تُوں توں یہ لگا جاوے
کہئے جہاں کرتا ہو تاثیر سخن کچھ بھی — وہ بات نہیں سُنتا کیا اُس سے کہا جاوے
ہم دیر کے جنگل میں بھولے پھرے ہیں کبتک — کعبے کا ہمیں رستہ خضر آکے بتا جاوے

ترے بندے ہم ہیں خدا جانتا ہے — خدا جانے تو ہم کو کیا جانتا ہے
نہیں عشق کا در دلذت سے خالی — جسے ذوق ہے وہ مزا جانتا ہے
گئے زیر برقع گئے گیسوؤں میں — غرض خوب وہ منہ چھپا جانتا ہے
مجھے جانے ہے آپ ساہی فریبی — دعا کو بھی میری دغا جانتا ہے
جفا اس پہ کرتا ہے حد سے زیادہ — جنہیں یار اہلِ وفا جانتا ہے

لگا لے ہے جھمکے دکھا کر اسی کو   جسے مغبچہ پارسا جانتا ہے
اسے جب نہ تب ہم نے بگڑا ہی پایا   یہی اچھے منہ کو بنا جانتا ہے
بلا شور انگیز ہے چال اس کی   اسی طرز کو خوشنما جانتا ہے
نہ گرمی جلاتی تھی ایسی نہ سردی   مجھے یار جیسا جلا جانتا ہے
مرے دل میں رہتا ہے تو ہی تبھی تو   جو کچھ دل کا ہے مدعا جانتا ہے
جہاں میر عاشق ہوا تو رہی تھا   یہ سودائی کب دل لگا جانتا ہے

یہی عشق ہی جی کھپا جانتا ہے   کہ جاناں سے بھی جی ملا جانتا ہے
بدی میں بھی کچھ خوبی ہووے گی تب تو   برا کرنے کو وہ بھلا جانتا ہے
مرا شعر اچھا بھی دانستہ ضد سے   کسو اور ہی کا کہا جانتا ہے
زمانے کے اکثر ستمگار دیکھے   وہی خوب طرز جفا جانتا ہے

دم میں دم جب تلک تھا سوچ رہا   سانس کے ساتھ سارے سانسے گئے

یار نے ہم سے بے ادائی کی   وصل کی رات میں لڑائی کی
بال و پر بھی گئے بہار کے ساتھ   اب توقع نہیں رہائی کی
خندۂ یار سے طرف ہو کر   برق نے اپنی جگ ہنسائی کی
کوہکن کیا پہاڑ توڑے گا   عشق نے زور آزمائی کی
چپکے اس کی گلی میں پھرتے رہے   دیر واں ہم نے بے نوائی کی
میر کی بندگی میں جانبازی   سیر سی ہو گئی خدائی کی

نہ وے لوگ ہیں اب نہ اجماع وہ — جہاں وہ نہیں یہ جہاں اور ہے
نہ ان لوگوں کی بات سمجھی گئی — نہ خلق اور اُن کی زباں اور ہے
تجھے گو کہ صد رنگ ہو مجھ سے کیں — مرے اور اک مہرباں اور ہے
ہوا رنگ بدلے ہے ہر آن میر — زمین و زماں ہر زماں اور ہے

کہو تو کب تئیں یوں ساتھ تیرے پیار رہے — کہ دیکھ جب تجھے تب جی کو مار مار رہے
ہوس سیر کے ٹک دل کی نکلے کچھ شاید — کوئی دن اور اگر موسمِ بہار رہے
اٹھا جو باغ سے بے دماغ تو نہ پھرا — ہزار مرغِ گلستاں تجھے پکار رہے
وصال و ہجر ٹھہر جاوے کچھ نہ کچھ آخر — جو بے قرار مرے دل کو بھی قرار رہے

جب سے جہاں ہے تب سے خرابی یہی ہے میر — تم دیکھ کر زمانے کو حیران کیا ہے

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں — اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی

گل نے کیا بہت کہ چمن سے نہ جائیے — گلگشت کو جو آئیے آنکھوں پر آئیے
میں بے دماغ کر کے تغافل چلا گیا — وہ دل کہاں کہ ناز کسو کے اٹھائیے
صحبت عجیب طرح کی پڑی اتفاق ہائے — کھو بیٹھئے جو آپ کو تو اس کو پائیے
خاطر ہی کے علاقے کی سب ہیں خرابیاں — اپنا ہو بس تو دل نہ کسو سے لگائیے
اے ہمدم ابتدا سے ہے آدم کشی میں عشق — طبع شریف اپنی نہ ایدھر کو لائیے
اتنی بھی کیا ہے دیدہ درائی کہ غیر سے — آنکھیں لڑائیے ہمیں آنکھیں دکھائیے
میچلا ہے وہ تو دیکھ کے لیتا ہے آنکھیں موند — سوتا پڑا ہو کوئی تو اس کو جگائیے

دل میں مسودے تھے بہت پر حضورِ یار
نکلا نہ ایک حرف بھی میری زبان سے

اول زمینیوں میں ہو مائل مرے طرف
جو حادثہ نزول کرے آسمان سے

وہ دل نہیں رہا ہے نہ وہ اب دماغ ہے
جی تن میں اپنے بجھتا سا کوئی چراغ ہے

یارب کھینگے پنبۂ مرہم کہاں کہاں
سوزِ دروں سے ہائے بدن داغ داغ ہے

مدت ہوئی کہ زانو سے اٹھتا نہیں ہے سر
کڑھنے سے راتدن کے ہمیں کب فراغ ہے

گھر گھر پھرے ہے جھانکتی ہر صبح چوں نسیم
پردے میں کوئی ہے کہ یہ اس کا سراغ ہے

طبیعت نے عجب کل یہ ادا کی
کہ ساری رات وحشت ہی رہا کی

نمایش داغِ سودا کی ہے سر سے
بہار اب ہے جنوں کی ابتدا کی

مجھی کو ملنے کا ڈھب کچھ نہ آیا
نہیں تقصیر اس نا آشنا کی

گئے جل حرفِ عشقی سے جگر دل
رہی تھی جان سو برسوں جلا کی

ہم رو رو کے دردِ دلِ دیوانہ کھینگے
جی میں ہے کبھو حالِ غریبانہ کھینگے

سودائی و رسوا و شکستہ دل و خستہ
اب لوگ ہمیں عشق میں کیا کیا نہ کہینگے

ہوں دربدر و خاک بسر چاک گریباں
اس طور سے کیونکر مجھے رسوا نہ کہینگے

ویرانے کو مدت کے کوئی کیا کرے تعمیر
اجڑی ہوئی آبادی کو ویرانہ کہینگے

موقوف غمِ میر کہ شب ہو چلی ہمدم
کل رات کو پھر باقی یہ افسانہ کہینگے

پامال لوگ آگے کیا کیا ہوئے ہیں تم سے
اس پر بھی تم جو آئے یاں تم نے سر اٹھائے

ہم کبھو غم سے آہ کرتے تھے
آسماں تک سیاہ کرتے تھے

اے خوشا حال اس کا جس کا وے
حال عمداً تباہ کرتے تھے

برسوں رہتے تھے راہ میں اُسکی
تب کچھ اک اس سے راہ کرتے تھے

پنجی آنکھیں ہم اُس کو دیکھا کئے
کبھو او پنجی نگاہ کرتے تھے

کیا زمانہ تھا وہ جو گزرا میر
ہمدگر لوگ چاہ کرتے تھے

چرخ پر اپنا مدار۔ دیکھئے کب تک رہے
ایسی طرح روزگار۔ دیکھئے کب تک رہے

سہرے کہاں تک پڑیں۔ آنسوؤں کے چہرے پر
گریہ گلے ہی کا ہار۔ دیکھئے کب تک رہے

روئے سخن سب کا ہے۔ میری غزل کی طرف
شعر ہے میرا شعار۔ دیکھئے کب تک رہے

گیسوؤ رخسار یار۔ آنکھوں ہی میں پھرتے ہیں میر
یہ لیل و نہار۔ دیکھئے کب تک رہے

بہت نامہرباں رہتا ہے یعنے
ہمارے حال پر کچھ مہرباں ہے

ہمیں جس جائے کل غش آگیا تھا
وہیں شاید کہ اس کا آستاں ہے

اہلِ ستم کے ہو نا جور و جفا ہی کرنا
انصاف سے نہ کہنا یہ رسم ہے کہاں کی

ہے سبزۂ لبِ جو اس لطف سے چمن میں
جوں بھیگتی مسیں ہوں کوئی سرو نوجواں کی

ہیں گھر جہاں میں اپنے لڑکوں کے سے بنائے
جب چاہا تب مٹایا بنیاد کیا جہاں کی

جب سامنے گئے ہم ہم نے اُسے دعا دی
شکل اُن نے دیکھتے ہی غصہ کیا زباں کی

سبزہ ہے آبجو ہے فصلِ بہار بھی ہے
سرگرم جلوہ دیکھو پہلو میں یار بھی ہے

یہ تو نہیں کہ ہم پہ ہر دم ہے بے دماغی — آنکھیں دکھاتے ہیں تو چتون میں پیار بھی ہے
گل ہم کنار ہو گا ہنس کر کبھو چمن میں — پر کم بغل ہے بلبل اس کو قرار بھی ہے
ہوں وعدہ گاہ میں تو پر میں ہی جانتا ہوں — کچھ اضطراب بھی ہے کچھ انتظار بھی ہے
جوں موج ہم بغل ہوں نایاب اس گہر سے — دریا کی سیر بھی ہے بوس و کنار بھی ہے
ہم جبریوں سے کیا ہو بے دست و پا و عاجز — کہنے کو کہتے ہیں تو کچھ اختیار بھی ہے
جانا مسلّم آیا اس خاکداں سے گو پھر — مشکل گزر ہے رستہ گرد و غبار بھی ہے

ہیگی طلب شرطیاں۔ کچھ تو کیا چاہیئے — بیٹھے نہیں بنتی میاں۔ کچھ تو کیا چاہیئے
عشق میں اے ہمزباں۔ کچھ تو کیا چاہیئے — گریہ و شور و فغاں۔ کچھ تو کیا چاہیئے
ہاتھ رکھے ہاتھ پر۔ بیٹھے ہو کیا بیخبر — چلنے کو ہے کارواں۔ کچھ تو کیا چاہیئے
میں جو کہا تنگ ہوں۔ مارمروں کیا کروں — وہ بھی لگا کہنے ہاں۔ کچھ تو کیا چاہیئے
کیا کروں دل خوں کروں۔ شعر ہی موزوں کروں — چلتی ہے اب تک زباں۔ کچھ تو کیا چاہیئے
ہو نہ سکے گر نماز۔ دل کی طرف کر نیاز — وقت گیا پھر کہاں۔ کچھ تو کیا چاہیئے
چاہوں کسو سے دعا۔ دل کی کروں اب دوا — نفع ہو پھر یا زیاں۔ کچھ تو کیا چاہیئے
یہ تو نہیں دوستی۔ ہم سے جو تم کو رہی — پاسِ دلِ دوستاں۔ کچھ تو کیا چاہیئے
میرؔ نہیں پیر تم۔ کاہلی اللہ رے — نامِ خدا ہو جواں۔ کچھ تو کیا چاہیئے

کر تامل کہ حال ہم میں رہا نہیں ہے غموں کے مارے
جو کچھ صبر و سا جنہوں پہ تھا سو شکیب و تاب و تواں سدھارے
ہوئے ہیں غائر قیامت اب تو گئے جگر تک گئے ہیں دل تک
جو ٹک بھی دیکھے وہ غور سے تو جراحت اسکو دکھادیں سارے

ہماری آنکھیں بہیں ہیں اتنی کہ اب ہے دریا محیطِ عالم
کہیں کہیں جو رہے ہیں مردم سو بیٹھے ہیں وے کنے کنارے

کریں تحمل سو کا ہے پر ہم مدام بیخود ہمیشہ غش ہے
گئی ہے طاقت دلوں سے شاید نہیں ہے آیا جگر ہمارے

کبھو سروں پر ہے تیغِ نالہ کبھو سنانِ فغاں جگر پر
کسو سے کہنے کا کچھ بھی حاصل گئے ہیں جو لوگ کے وقت بارے

بھری تھی آتش کہاں کی یارب دل و جگر میں کہ نصف شب کو
لگا جو رونے تو جائے آنسو مری مژہ سے گرے شرارے

قبولِ عشق و محبت اتنا ہوا ہے اے میر سیر قابل
مدام جاتے دکھائی دوں ہوں کبھو نہ اُن نے کہا کہ آ رے

لالہ کنارِ دریا نکلا ہے کیا زمیں سے — اُٹھتی نہیں ہیں آنکھیں دیکھو اُدھر کہیں سے
بالیدگی سے پہنچے گل آدمی کے سر تک — ہو واں تو رنگ ٹپکے جیب اور آستیں سے
خوش رنگ تر ہے ہر گل رخسار سے پری کے — صد برگ واں طرف ہے خورشید کی جبیں سے
صندل بھری جبیں سے کیا صبح چہرہ ہووے — اس قطعۂ چمن کے محبوبِ خوش نشیں سے
جب میر جان دینا بوسے کے بدلے ٹھہرا — تب خوف کیجیے کیا پیشانیوں کی چیں سے

فردیات

دل گیا رسوا ہوئے آخر کو سودا ہو گیا — اس دو روزہ زیست میں ہم پر بھی کیا کیا ہو گیا

آنے کے وقت تم تو نہیں کہیں رہے ۔ اب آئے تم تو فائدہ ہم ہی نہیں رہے

اُن نے دیکھا جو اُٹھتے سوتے سے ۔ اُڑ گئے آئینے کے توتے سے

بس نہ لگ چل نسیم مجھ سے کہ میں ۔ رہ گیا ہوں چراغ سا بجھ کر

مشہور ہیں عالم میں تو کیا ہیں بھی کہیں ہم ۔ القصہ نہ در پے ہو ہمارے کہ نہیں ہم

عنقا سر و برگیم میرؔ بس از فقرا ہیچ ۔ عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

رباعیات

دامن عزلت کا اب لیا ہے میں نے ۔ دل مرگ سے آشنا کیا ہے میں نے
تھا چشمۂ آب زندگانی نزدیک ۔ پر خاک سے اس کو بھر دیا ہے میں نے

اترا تھا غریبانہ کنارے سے آ کر ۔ لب خشک موا سو نورِ چشم حیدر
ترحلق دم آب سے اُس کا نہ ہوا ۔ لے آب فرات خاک تیرے سر پر

تیغا نے سے دل اپنے اٹھائے نہ گئے ۔ کعبے کی طرف مزاج لائے نہ گئے
طورِ مسجد تو برہمن کیسا جانے ۔ یاں مدت عمر میں ہم آئے نہ گئے

چپکا چپکا پھرا نہ کر تو غم سے — کیا حرف و سخن عیب ہے کچھ محرم سے
آخر کو رکے رہتے جنوں ہوتا ہے — اے میر کوئی بات کیا کر ہم سے

ہر لحظہ رلاتا ہے کڑھاتا ہے مجھے — ہر آن ستاتا ہے کھپاتا ہے مجھے
کل میں جو کہا رنج سے حاصل میر — بولا ترا آزار خوش آتا ہے مجھے

دل جنکے بجا ہیں انکو آتی ہے خواب — آرام خوش آتا ہے سہاتی ہے خواب
میں غمزدہ کیا اپنے دنوں کو روؤں — میری تو جہاں شب ہوئی جاتی ہے خواب

ہم میر سے کہتے ہیں نہ تو رویا کر — ہنس کھیل کے ٹک چین سے بھی سویا کر
پایا نہیں جانے کا وہ در نایاب — کڑھ کڑھ کے عبث جان کو مت کھویا کر

ہر چند کہ طاعت میں ہوا ہے تو پیر — پر بات مری سن کہ نہیں ہے تاثیر
تسبیح بکف پھرنے سے کیا کام چلے — منکے کی طرح دل نہ پھرے جبتک میر

کیا میر تجھے جان ہوئی تھی بھاری — جو اس بت سنگدل سے کی تھی یاری
بیمار بھلا کیا کوئی ہووے اس کا — پرہیز کرے جس سے خدائی ساری

حیرت ہے کہ ہو رقیب محرم تیرا — ہمراز و انیس وقت و ہمدم تیرا
جوں عکس ترے سامنے اکثر وہ ہو — جوں آئینہ منہ تکا کریں ہم تیرا

کچھ خواب سی ہے میر یہ صحبت داری
اٹھ جائینگے یہ بیٹھے ہوئے بیچاری
کیا آنکھوں کو کھولا ہے تنک گوش کو کھول
افسانہ ہے پل مارتے مجلس ساری

دل خون ہو اضبط ہی کرتے کرتے
ہم ہو ہی چلے دکھوں کے بھرتے بھرتے
اے مایۂ زندگی ستم ہے یہ اگر
بھر آنکھ تجھے دیکھیں نہ مرتے مرتے

کیا کیا اے عاشقی ستایا تو نے
کیسا کیسا ہمیں کھپایا تو نے
ادل کے سلوک میں کہیں کا نہ رکھا
آخر کو ٹھکانے ہی لگایا تو نے

ملئے اس شخص سے جو آدم ہووے
نازاس کو کمال پر بہت کم ہووے
ہو گرم سخن تو گرد آوے یک خلق
خاموش رہے تو ایک عالم ہووے

ہر صبح غموں میں شام کی ہے ہم نے
خونابہ کشی مدام کی ہے ہم نے
یہ مہلتِ کم کہ جس کو کہتے ہیں عمر
مر مر کے غرض تمام کی ہے ہم نے

ہیں گو کہ سبھی تمہاری پیاری باتیں
پر جی سے نہ جائینگی تمہاری باتیں
آنکھیں ہیں ادھر روئے سخن اور طرف
یار و نکی نظر میں ہیں یہ ساری باتیں

ایسا نہ ہوا کہ ہم نے شادی کی ہو
یا سیرِ بہارِ باغ و وادی کی ہو
پژمردہ کلی کے رنگ اس گلشن میں
غالب ہے یہی کہ نامرادی کی ہو

محشر میں اگر یہ آتشیں دم ہوگا
ہنگامہ سب اِک لپٹ میں برہم ہوگا
تکلیف بہشت کاش مجھکو نہ کریں
ورنہ وہ باغ بھی جہنّم ہوگا

ہر صبح مرے سر پہ قیامت گزری
ہر شام نئی ایک مصیبت گزری
پامالِ کدورت ہی رہا یاں دن رات
یوں خاک میں ملتے ہمکو مدت گزری

آئی نہ کبھو رسمِ تلطّف تم کو
کرتے نہ سنا ہم پہ تاسّف تم کو
مرتے ہیں اور منہ چھپاتے ہو تم
ہم سے ابتک بھی ہے تکلف تم کو

ہجراں میں کیا سب نے کنارا آخر
اسباب کیا جینے کا سارا آخر
نے تاب رہی نہ صبر و یارا آخر
آخر کو ہوا کام ہمارا آخر

زانو پہ قدم خم شدۂ سر کو لایا
جائے ذنداں کو ہم نے خالی پایا
آنکھوں کی بصارت میں تفاوت آیا
پیری نے عجب سماں ہمیں دکھلایا

وہ عہد گیا کہ جو رُس کے سہیئے
وہ بات نہیں رہی کہ چپکے رہیئے
جب جی ہی چلا تو صرفہ کیا ہے
بے صرفہ جو کچھ کہ منہ میں آئے کہیئے

مسجد میں تو شیخ کو خروشاں دیکھا
میخانے میں جوش بادہ نوشاں دیکھا
اِک گوشۂ عافیت جہاں میں ہم نے
دیکھا تو محلۂ خموشاں دیکھا

جس وقت شروع یہ حکایت ہوئی　رنجیدگی یک دگر نہایت ہوگی
احوال وفا کا اپنی ہرگز مجھ سے　مت پوچھ کہ کہنے میں شکایت ہوگی

کاہے کو کوئی خراب خواری ہوتا　کاہے کو ہمیں یہ جان بھاری ہوتا
دلخواہ ملاپ ہوتا تو تو ملتے　اے کاشکے عشق اختیاری ہوتا

پھر تپہ دل پہ اضطرابی آئی　یعنے کہ اجل میری شتابی آئی
بکھرا جاتا ہے ناتوانی سے جی　عاشق نہ ہووے کہ اک خرابی آئی

پھر عشق میں میر پاؤں دھرتا ہے گا　جی اور منغص اپنا کرتا ہے گا
سب مل کے بلا سے سمجھا آویں　افسوس کہ وہ جوان مرتا ہے گا

چپکے رہنا نہ میر دل میں ٹھانو　بولو چالو کہا ہمارا مانو
اک حرف نہ کہہ سکوگے وقت رفتن　چلنے کو زبان کے غنیمت جانو

کی حسن نے تجھ سے بے وفائی آخر　خوبی نہ رہی نہ میرزائی آخر
رونق نہ رہی غبار خط سے منہ پر　اس سبز قدم نے خاک اڑائی آخر

یاروں کو کدورتیں ہیں اب تو ہم سے　جس روز کہ ہم جائینگے اس عالم سے
اس روز کھلے گی صاف سب پر یہ بات　اس بزم کی رونق تھی ہمارے دم سے

تیرا اے دل یہ غم فرد بھی ہو گا　　اندیشۂ رزق کم کبھو بھی ہو گا
کھانے کو دیا ہے آج حق نے تجھکو　　کل بھی دیوے گا کل جو تو بھی ہو گا

رنجش کی کوئی اس کی روایت نہ سنی　　بے صرفہ کسو وقت حکایت نہ سنی
تھا میر عجب فقیر صابر شاکر　　ہم نے اس سے کبھو شکایت نہ سنی

مستزاد ہندی

دلّی میں بہت سخت کی اب کے گزراں　　دلکو کر سنگ
غیرت نہ رہی عاقبت کار نہ شاں　　کھینچا ننگ
یاروں میں نہ تھا کوئی مروت جو کرے　　اجڑے تھے گھر
تا مدّ نظر صاف پڑے تھے میداں　　عرصہ تھا تنگ

تا چند غم دل سے حکایت کریئے　　ہو ہو کر تنگ
کس کس سے شب و روز شکایت کریئے　　آتا ہے ننگ
سختی کوئی اے صنم کہاں تک کھینچے　　ہے جی میں کہ اب
ہو نالہ ترے دل میں سرایت کریئے　　پر تو ہے سنگ

مخمس در شہر کاماگفتہ شدہ

قابل ہے میری سیر کے اطوار روزگار — چالیں عجب طرح کی چلی ہیں عجب شعار
کرتا ہے بدسلوکی سبھوں سے یہ بے مدار — لاتا ہے روز فتنۂ تازہ بروئے کار
دل داغ داغ رہتے ہیں اس سے جگر فگار

کاما سے تلخکام اٹھایا مرے تئیں — دلی میں بیدلا نہ پھرایا مرے تئیں
ہم چشموں کی نظر سے گرایا مرے تئیں — حاصل کہ بیس سرمہ بنایا مرے تئیں
میں مشتِ خاک مجھ سے اسے اسقدر غبار

لشکر میں مجھ کو شہر سے لایا پئے تلاش — یاں آکے گزری میری عجب طور سے معاش
پانی کسو سے مانگ پیا میں کسو سے آش — اس واقعے سے آگے اجل پہنچی ہوتی کاش
ناموس رہتی فقر کی جاتا پہ اعتبار

مدت رہا تھا ساتھ جنہوں کے خراب حال — دانستہ ان سبھوں نے کیا مجھ کو پائمال
آخر کو آیا مجھ میں انہوں میں نپٹ ملال — یہ زندگی سہل ہوئی جان کی وبال
اس جمع بیں کسو کو نہ پایا میں دستیار

جانا جہاں نہ تھا مجھے سو بار واں گیا — ضعف قوی سے دست بدیوار واں گیا
محتاج ہو کے ناں کا طلبگار واں گیا — چارہ نہ دیکھا مضطر و ناچار واں گیا
اس جانِ ناتواں پہ کیا صبر اختیار

در پر ہر اک دنی کے سماجت مری گئی — نالایقوں سے ملتے لیاقت مری گئی
کیا مفت ہائے شان شرافت مری گئی — ایسا پھرایا اُن نے کہ طاقت مری گئی
مشہورِ شہر اب ہوں سبکسار و بے وقار

عرصہ تھا مجھ پہ تنگ اٹھا ہو کے بیجاں
پوچھا نہ مجھ کو یک لب نالاں سے کنہو نے یاں
آشفتہ خاطری نے پھرایا کہاں کہاں
کم پائی پر بھی سیر کیا میں نے سب جہاں
برسوں کا راز مجھ سے ہوا آخر آشکار

پرداخت میری ہو نہ سکی اک امیر سے
عقدہ کھلا نہ دل کا دعائے فقیر سے
رستے ہمیشہ آتے رہے سر پہ تیر سے
ہر چند التجا کی صغیر و کبیر سے
لیکن ہوا نہ رفع مرے دل کا اضطرار

کن نے کی اپنے حال پہ شفقت سے ایک نگاہ
نکلے ہے کس سے طور پر اپنے سخن کی راہ
بولا نہ کوئی ہم سے کہ تم کیوں ہوئے تباہ
اسلوب پہ جینے کا ہو کس طرح سے آہ
ہم ایک ناتوان و ضعیف اور غم ہزار

حاجت مری روا دل پر درد نے نہ کی
تاثیر اشک سرخ و رخ زرد نے نہ کی
تدبیر ایک دم بھی دم سرد نے نہ کی
دلجوئی میری حیف کسی فرد نے نہ کی
طاقت رہی نہ دل میں گیا جان سے قرار

ہر ترک شوخ چشم کرے مجھ پہ کب نظر
ہر چند بند باندھے مرے خوں پہ کیا کمر
ہر دامدار قصد کرے یہ کہاں جگر
یہ منہ نہیں کسی کا جو منہ کو کرے ادھر
ہر کوئی جانتا ہے کبھی کا ہوں میں شکار

دل سر بسر خراب ہے تعمیر کیا کروں
آشفتگی حال کی تعبیر کیا کروں
خوننابہائے چشم کی تقریر کیا کروں
زردی رنگ چہرہ کی تحریر کیا کروں
آیا جو میں چمن میں خزاں ہو گئی بہار

حالت تو یہ کہ مجھ کو غموں سے نہیں فراغ
دل سوزش درونی سے جلتا ہے جوں چراغ
سینہ تمام چاک ہے سارا جگر ہے داغ
ہے نام مجلسوں میں مرا میر بے دماغ
از بسکہ کم دماغی نے پایا ہے اشتہار

مخمس

مشکل اپنی ہوئی جو بود و باش آئے لشکر میں ہم برائے تلاش
آن کے دیکھی یاں کی طرز معاش ہے لب ناں یہ سو جگہ پرخاش
نے دم آب ہے نہ کچھ آش

مرنے کے مرتبے میں ہیں احباب جو شتا سا ملا سو بے اسباب
تنگدستی سے سب بحال خراب جسکی ہے پال تو نہیں ہے طناب
جسکے ہے فرش تو نہیں ہے فراش

زندگانی ہوئی ہے سب یہ وبال کنجڑے جھینکے میں روتے ہیں بقال
پوچھ مت کچھ سپاہیوں کا حال ایک تلوار بیچے ہے یک ڈھال
بادشاہ و وزیر سب قلاش

بیسے والے جو تھے ہوئے ہیں فقیر تن سے ظاہر رگیں ہیں جیسی لکیر
ہیں معذب غرض صغیر و کبیر مکھیاں سی گریں ہزاروں فقیر
دیکھیں ٹکڑا اگر برابر ماش

شور مطلق نہیں کسو سر میں زور باقی نہ اسپ و اشتر میں
بھوک کا ذکر اقل و اکثر میں خانہ جنگی سے امن لشکر میں
نہ کوئی رند ہے نہ کوئی اوباش

لعل خیمہ جو ہے سپہر اساس پالیں ہیں رنڈیوں کی اسکے پاس
ہے زنا و شراب بے وسواس دعیب کریئے نہیں سے قیاس
وقعہ کو تہ رئیس ہے عیاش

جتنے ہیں یاں امیر بے دستور | پھر بحسن سلوک سب مشہور
پہنچنا ان تلک بہت ہے دور | بات کہنے کا واں کسے مقدور
حاصل ان سے نہ دل کو غیر خراش

چار لچے ہیں مستعدِ کار | دس تلنگے جو ہوں تو ہے دربار
ہیں وضیع و شریف سارے خوار | لوٹ سے کچھ ہے گرمیٔ بازار
سو بھی قندِ سیاہ ہے یا ماش

در پہ عہدِ دُوَل کے روز و شب شر و شور | حرف یکسر فریب و رشوت خور
بے لئے دیکھیں نے کسو کی اور | مردہ شو پردہ سب کفن کے چور
رحمۃ اللہ بر اولین نباش

یک بیک گر کسو کی موت آئی | اسکے مردے کی پھر ہے رسوائی
کیونکہ پہنچے ہے جن کو امرائی | سب دے اولادِ حاتمِ طائی
کون دے کر کفن اٹھاوے لاش

بالضرورت گیا میں جس کے گھر | آدمی کی نہ جنس تھا وہ خر
بات کرنے لگا تو بیچی نظر | بے مروت سفیہ مدنظر
قابلِ صد ہزار شاش و تراش

ہے جنہیں کچھ بھی رویت دربار | سو فریبندہ مکری و غدار
کاذب و مفت بر ہیں دل آزار | ڈول ان کا ہے یہ کہ کریئے خوار
کام ان کا یہ ہے خراش و تراش

جس پہ ٹھہری ہے آ کے سرداری | ان سے ہم کو تھی چشم دلداری
معرفت ان کی بعد صد خواری | فردِ سخط ہو لی جو یک باری
جیسے کھنچیے لکیریں کوئی نقاش

اِس لکھے کا نہیں ٹھکانا کچھ — وہم میں بھی نہیں ہے پانا کچھ
جسپہ دستخط نہ اُن سے جانا کچھ — بن نہ آیا مجھے بہانا کچھ

غیر اسکے کہ لے اُٹھوں بشاش

واں سے اُٹھ کر میں پال میں آیا — سخت تغیر حال میں آیا
بارہا یہ خیال میں آیا — کہ زیاں شہ کے مال میں آیا

واسطے میرے سو مرا یہ قماش

بخشدوں جامہ تک جو ہو قدرت — آٹھوں آتے ہیں خرچ یک ساعت
دس روپے دوں گدا کو بے مہلت — مقتضی ہوئے کب مری ہمت

صاحبانِ کرم کے تئیں شاباش

ہو جو اُن لوگوں میں گدا کا گزر — سہم رہ جائیں سب دیکھیں دھر
دیر کے بعد یہ کہیں چل کر — شاہ جی سے خدا سبھوں کی خبر

سو بھی یہ بات ہے پس از کنگاش

یاروں کی جود کا بیاں کیا ہے — وہم میں اُن کے بھی جہاں کیا ہے
آشکارا ہے سب نہاں کیا ہے — دیکھتے ہیں کہیں کہ یاں کیا ہے

ایسی صحبت میں ہم نہ ہوتے کاش

بس قلم اب زباں کو اپنی سنبھال — خوشنما کب ہے ایسے قال و مقال
ہے کڑی سب چرخِ روسیہ کی چال — مصلحت ہے کہ رہیے ہو کر لال

فائدہ کیا جو راز کریے فاش

مثنوی جھوٹ

اے جھوٹ آج شہر میں تیرا ہی دور ہے — شیوہ یہی سبھوں کا یہی سب کا طور ہے
اے جھوٹ تو شعار ہوا ساری خلق کا — کیا شہ کا کیا وزیر کا کیا اہلِ دلق کا
اے جھوٹ تجھ سے ایک خرابی میں شہر ہے — اے جھوٹ تو غضب ہے قیامت ہے قہر ہے
اے جھوٹ رفتہ رفتہ ترا ہو گیا رواج — تیری متاع بابِ ہے ہر چار سو میں آج
اے جھوٹ کیا کہوں کہ بلا زیرِ سر ہے تو — اے جھوٹ سچ یہ ہے کہ عجب فتنہ گر ہے تو
اے جھوٹ کب ہے عرصے میں تجھ سا حریف اب — تیرے ہی حکم کش ہیں وضیع و شریف اب
اے جھوٹ تیرے شہر میں ہیں تابعیں سبھی — مر جائے کیوں نہ کوئی دے سچ بولیے کبھی
کہنے سے آج اُن کے کوئی دل نہ شاد ہو — فردا کہیں تو اُس سے قیامت مراد ہو
وعدے گھڑی کے پہرونکے سب آزما چکے — برسوں تک انتظار کیا جی ہی جا چکے
اے جھوٹ رنگ تیرے کرے کوئی کیا بیاں — رکھتا ہے جیسے غنچہ زباں تو نہ زباں ہے
یوسف کہ تھا بنی و صداقت شعار تھا — پھر حسنِ ظاہری سے وہ باغ و بہار تھا
پایانِ کار تیرے سبب چاک پیرہن — زنداں میں جا کے برسوں رہا چھوڑ کر وطن
اے جھوٹ تو تو ایک دلاویز ہے بلا — آشوبِ گاہ تجھ سے زمانہ سدا رہا
کس جانکنی سے کوہکنِ کوہکن نے کی — تصویر کھود شیریں کے پیشِ نظر رکھی
نزدیک جب ہوا کہ وہ مطلوب سے ملے — اب صبح و شام غنچۂ مقصودِ دل کھلے
دلالہ کے تو پردے میں آ کام کر گیا — دو باتوں میں وہ عاشقِ دلخستہ مر گیا
اے جھوٹ تجھ سے فتنے ہزار دل اٹھا گئے — ہنگامہ و فساد بھی ہر سو رچا گئے
اے جھوٹ راستی سے نہیں گفتگو کہیں — کہنے کو ہاں کہیں ہیں حقیقت میں ہے نہیں

اے جھوٹ اِس طرح ہیں بہت جی سے جا چکے
وعدوں میں آہ لوگوں کے وعدے ہی آ چلے

اے جھوٹ اس زمانے میں کیونکر چلے معاش
ہے تنگ جھوٹ بولنے سے عرصۂ تلاش

سردار جس سے سب متعلّق ہے کاروبار
سچ بولنا ہے اسکے تئیں سخت ننگ و عار

پھر سب مدارِ کار دروغی و مفتری
صدق و صفا و راستی کے عیب سے بری

مشکل حصولِ کام ہے یاں حاصلِ کلام
یا توں ہی باتوں کام ہوا خلق کا تمام

اے جھوٹ دل مرا بھی بہت دردناک ہے
ان کاذبوں سے صبح نمط جیب چاک ہے

مثنوی دیگر گھر کا حال

کیا لکھوں میر اپنے گھر کا حال
اِس خرابی میں میں ہوا پامال

گھر کہ تاریک و تیرہ زنداں ہے
سخت دِل تنگ یوسفِ جاں ہے

کوچۂ موج سے ہے آنگن تنگ
کوٹھڑی کے حبابِ کے سے ڈھنگ

چار دیواری سو جگہ سے خم
تر تنک ہو تو سو کھتے ہیں ہم

لونی لگ لگ کے جھڑتی ہے ماٹی
آہ کیا عمر بے مزہ کاٹی

کیا کہے مینہ سقف چھلنی تمام
چھت سے آنکھیں لگی رہے ہیں مدام

اِس چلکش کا علاج کیا کریئے
راکھ سے کیتلک گڑھے بھریئے

جا نہیں بیٹھنے کو مینہ کے بیچ
ہے چلکش سے تمام ایواں کیچ

آنکھیں بھر لا کے دیکھیں ہیں سب
کیونکہ پردا رہے گا یارب اب

جھاڑ باندھا ہے مینہ نے دن رات
گھر کی دیواریں ہینگی جیسے پات

باؤ میں کانپتے ہوں جو تھر تھر
اُن پہ ردّا رکھے کوئی کیونکر

کیچ لے لے کے باسے چھوپا ہے
چھوپنا کا ہے کا ہے تھوپا ہے

تسکو پھر پرچھتی بھی ہے ہی نہیں ٹوٹا اک بوریا سا ڈالو کہیں
ڈھانکو دیوار یا اٹھا رکھو یا ہمارے لئے بچھا رکھو
ایک حجرہ جو گھر میں ہے واثق سو شکستہ تر از دلِ عاشق
کہیں سوراخ ہے کہیں ہے چاک کہیں جھڑ جھڑ کے ڈھیر سی ہے خاک
کہیں گھونسوں نے کھود ڈالا ہے کہیں چوہے نے سر نکالا ہے
کہیں گھر ہے کسو چھچھوندر کا شور ہر کونے میں ہے مچھر کا
کونے ٹوٹے ہیں طاق پھوٹے ہیں پتھر اپنی جگہ سے چھوٹے ہیں
اینٹ چونا کہیں سے گرتا ہے جی اسی حجرے ہی میں پھرتا ہے
رکھ کے دیوار ادھر اودھر سے لاکے یارب بناؤں کس گھر سے
چارپائی جب اِس میں بچھوائی پہلے چلپاسہ ہی نظر آئی
سام ابرص کہ ہے وداے خراج ہر جگہ یاں سے ہے نمایاں آج
بیکر اپنی خدا نے رکھی ہے ڈالس اک ایک جیسی لکھی ہے
آگے اِس حجرے کے ہے اک ایوان وہی اِس تنگ خلق کا ہے مکان
کڑی تختے سبھی دھوئیں سے سیاہ اس کی چھت کی طرف ہمیشہ نگاہ
کبھو کوئی سینو لیا ہی پھرے کبھو چھت سے ہزار پائے گرے
کوئی تختہ مکاں سے ٹوٹا ہے کوئی داسا مکاں سے چھوٹا ہے
دب کے مرنا ہمیشہ مد نظر گھر کہاں صاف موت ہی کا گھر
مٹی تودہ جو ڈالی چھت پر ہم تھے جو شہتیر جوں کمان ہیں خم
مضطرب ہو کے جو بچھائی بہت ہر کڑی نے کڑی اٹھائی بہت
پھر سے اِس مٹی میں کرختی ہے تختہ تختہ ہوئی یہ سختی ہے
دیں ہیں اڑواڑیں پھر جو حد سے زیاد چل ستوں سے مکان دے ہے یاد

اینٹ مٹی کا در کے آگے ڈھیر
گرتی جاتی ہے ہو کے ہو کے منڈیر

جیتے ہیں جب تلک نہیں پہنچی
ورنہ کیا بس ہے جو یہیں پہنچی

کنگنی دیوار کی نپٹ بے حال
بڈڑی کا بوجھ بھی سکے نہ سنبھال

طوطا، مینا تو ایک بابت ہے
پودنا پھدکے تو قیامت ہے

کیونکہ ساون کٹے گا اب کی بار
تھرتھراوے جھنیری سے دیوار

ہو گیا ہے جو اتفاق ایسا
شاق گزرے ہے کیا کہوں کیسا

ہو کے مضطر لگے ہیں کہنے سب
اڑ جھنیری کہ ساون آیا اب

تیتری یاں جو کوئی آتی ہے
جانِ محزوں نکل ہی جاتی ہے

نہیں دیوار کا یہ اچھا ڈھنگ
کہیں کھسکے تو ہے قیامت تنگ

ایک دن ایک کوّا آ بیٹھا
بے گماں جیسے لوّا آ بیٹھا

چیل سے لوگ دوڑے کرتے شور
کہ نہ حائط میں کچھ رہا تھا زور

ہو نہ ایسا کہ اپنی چال سے چلے
دوڑے اچھلے کہ ہال ہال چلے

نہیں وہ زاغ چار پانوں پھرا
ایک کالا پہاڑ آن گرا

مٹی اس کی کہیں کہیں کھسکی
جی ڈہا اور چھاتی بھی دھسکی

سان کر خاک لگ گئے دو چار
بارے جلدی درست کی دیوار

اچھے ہونگے کھنڈر بھی اس گھر سے
پر یہ ہے یک خرابی گھر در سے

اکھڑے پکھڑے سے کواڑ لوٹی وصید
زنگی زنجیر ایک کہنہ حدید

خاک لوہے کو جیسے کھاوے پاک
چھیڑ لیجے تو پھر تری ہے خاک

بند رکھتا ہوں در جو گھر میں رہوں
قدر کیا گھر کی جبکہ میں ہی نہ ہوں

گھر بھی پھر ایسا جیسا ہے مذکور
ہے خرابے سے شہر میں مشہور

جس سے پوچھو اسے بتاوے شتاب
ساری بستی میں ہے یہی تو خراب

ایک چھپر ہے شہر دلی کا — جیسے روضہ ہو شیخ چلی کا

بانس کی جا دیئے تھے سرکنڈے — سو وے مینھوں میں سب ہوئے ٹھنڈے

گل کے بندھن ہوئے ہیں ڈھیلے سب — پاکھے رہنے لگے ہیں گیلے سب

مینہ میں کیوں نہ بھیگے یکسر — پھوس بھی تو نہیں ہے چھپّر پر

مٹی ہو کر گرا ہے سب والا — وہ رہے یاں جو ہووے ڈھب والا

واں یہ ٹپکا تو یاں سرک بیٹھا — یاں جو بھیگا تو واں تنک بیٹھا

حال کس کو ہے اولتی کا یاد — مگری اس جھگڑے میں گئی برباد

کہیں صحنک رکھوں کہیں پیالا — کہیں ہانڈی کے ٹھیکرے لالا

ٹپکے دو چار جا تو بند کروں — پنیچ کوئی لڑاؤں فند کروں

یاں تو جھانکے ہزار ہیں تنہا — کچھ نہیں ہائے مجھ سے ہو سکتا

بسکہ بدرنگ ٹپکے ہے پانی — کپڑے رہتے ہیں میرے افشانی

کوئی جانے کہ ہولی کھیلا ہوں — کوئی سمجھے ہے یہ کہ خیلا ہوں

مجھ سے کیا واقعی ہوا چارا — آسماں جو پھٹے تو کیا چارا

بانس جھینگر تمام چاٹ گئے — بھیگ کر بانس پھاٹ پھاٹ گئے

تنکے جاندار ہیں جو بیش و کم — تن پہ چڑیوں کو جنگ ہے باہم

ایک کھینچے ہے چونچ سے کر زور — ایک مگری پہ کر رہی ہے شور

پوچھ مت زندگانی کیسی ہے — ایسے چھپّر کی ایسی تیسی ہے

کیا کہوں جو جفا چکش سے سہی — چارپائی ہمیشہ سر پہ رہی

بوریا پھیل کر بچھا نہ کبھو — کونے ہی میں کھڑا رہا یک سو

ڈیوڑھی کی یہ خوبی در ایسا — چھپر اس چوچلے کا گھر ایسا

جنس اعلیٰ کوئی کھٹولا کھاٹ — پائے پٹی رہے ہیں جن کے پھاٹ

کھٹملوں سے سیاہ ہے سو بھی
چین پڑتا نہیں ہے شب کو بھی

شب بچھونا جو میں بچھاتا ہوں
سر پہ روزِ سیاہ لاتا ہوں

کیڑا اک ایک بھر ملوڑا ہے
سانجھ سے کھانے ہی کو دوڑا ہے

ایک چٹکی میں ایک چھنگلی پر
ایک انگوٹھا دکھاوے انگلی پر

گرچہ بہتوں کو میں مسل مارا
پر مجھے کھٹملوں نے مل مارا

ملتے راتوں کو گھس گئیں پوریں
ناخنوں کی ہیں لال سب کوریں

ہاتھ تکئے پہ گہ بچھونے پر
کبھو چادر کے کونے کونے پر

سلسلا یا جو پائینتی کی اور
وہیں مسلا کرا ایڑیوں کا زور

تو شک ان رگڑوں ہی میں سب پھاٹی
ایڑیاں یوں رگڑتے ہی کاٹی

جھاڑتے جھاڑتے گیا سب بان
ساری کھاٹو نکی چولیں نکلیں ندان

نہ کھٹولا نہ کھاٹ سونے کو
پائے پٹی لگائے کونے کو

جب نہ تب پنڈے پر لئے پائے
سیتلا کے سے دانے مرجھائے

سوتے تنہا نہ بان میں کھٹمل
آنکھ منہ ناک کان میں کھٹمل

کہیں پھڑکا کہ جیسی تاب گئی
آنکھ سے تا نگاہ خواب گئی

اک ہتھیلی پہ ایک گھائی میں
سیکڑوں ایک چارپائی میں

ہاتھ کو چین ہو تو کچھ کہئے
کب تلک یوں ٹٹولتے رہئے

یہ جو بارش ہوئی تو آخر کار
اس میں سی سالہ وہ گری دیوار

آہ کھینچی خرابی کیا کیا نہ
تھے جو ہمسائے وے ہیں ہمخانہ

ایسے ہوتے ہیں گھر میں تو بیٹھے
جیسے رستے میں کوئی ہو بیٹھے

دو طرف سے تھا کتوں کا رستا
کاش جنگل میں جا کے میں بستا

ہو گھڑی دو گھڑی تو دتکاروں
ایک دو کتے ہوں تو میں ماروں

چار جاتے ہیں چار آتے ہیں ۔ چار عف عف سے مغز کھاتے ہیں
کسے کہتا پھروں یہ صحبتِ نغز ۔ کتوں کا سا کہاں سے لاؤں مغز
وہ جو ایواں تھا حجرے کے آگے ۔ اسکے اجزا بکھرنے سب لاگے
کوٹھا بوجھل ہُوا تھا بیٹھ گیا ۔ پانی جز جز میں اُس کے پیٹھ گیا
کڑی تختہ ہر ایک چھوٹ پڑا ۔ ناگہاں آسمان ٹوٹ پڑا
میں تو حیران کار تھا اپنا ۔ کوئی اس دم نہ یار تھا اپنا
اینٹ پتھر تھے مٹی تھی یکسر ۔ خاک میں مل گیا تھا گھر کا گھر
چرخ کی کجروی نے پیسا تھا ۔ پر خدا میر مجھ سے سیدھا تھا
کتنے اک لوگ اس طرف دھائے ۔ یا ملک آسمان سے آئے
مٹی لے لے گئے وہ ہاتھوں میں ۔ کام نے شکل پکڑی ہاتوں میں
صورت اس لڑکے کی نظر آئی ۔ ہم جو مردے تھے جان سی آئی
آنکھ کھولی اِدھر اُدھر دیکھا ۔ اس خرابی کو بھر نظر دیکھا
قدرتِ حق دکھائی دی آکر ۔ یعنے نکلا درست وہ گوہر
داشت کی کوٹھڑی میں لا رکھا ۔ گھر کا غم طاق پر اٹھا رکھا
مومیائی کھلائی کچھ ہلدی ۔ فرصت اس کو خدا نے دی جلدی
غم ہوا سُن کے دوستداروں کو ۔ پھر بندھا یہ خیال یاروں کو
کہ مری بود و باش یاں نہ رہے ۔ گو تصرف میں یہ مکاں تر ہے
شہر میں جا بہم نہ پہنچی کہیں ۔ چار و ناچار پھر رہا میں وہیں
اب وہی گھر ہے بے سر و سایہ ۔ اور میں ہوں وہی فرومایہ
دن کو ہے دھوپ رات کو ہے اوس ۔ خواب راحت ہے یاں سے سو سو کوس
قصہ کوتہ دن اپنے کھوتا ہوں ۔ رات کے وقت گھر میں ہوتا ہوں

نہ اثر بام کا نہ کچھ در کا / گھر ہے کا ہے کا نام ہے گھر کا

مثنوی در ہجو خانۂ خود کہ بسبب شدت باراں خراب شدہ بود

جسم خاکی میں جس طرح جاں ہے / اِس طرح خانہ ہم پہ زنداں ہے
ظلمتیں اِس کی سب پہ روشن ہیں / زندہ در گور ہم کئی تن ہیں
ہے جو سرکوب اک بڑی دیوار / داں سے جھانکو تو ہے اندھیرا غار
بخت بد دیکھ سارے پرنالے / اسکے معمار نے ادھر ڈھالے
اب جو آیا ہے موسمِ برسات / دن کو ہے اپنے ہاں اندھیری رات
صحن میں آب نیزہ بالا ہے / کوچۂ موج ہے کہ نالا ہے
مینہ میں گھر کے پانچ چھ چھپّر / ہم غریبوں کے ہوتے ہیں سر پر
پر تلک تنکے تھے کچھ ایک نئے / سو دے چڑیونکے گھونسلونکو گئے
دل ہے کچھ مکڑیوں کا احساں مند / کہ انھوں نے کئے ہیں چھانکے بند
پھوس کچھ ہے کہیں سو آٹا ہے / بانس کو جھینگروں نے چاٹا ہے
اڑ گئی گھاس مٹی ہے دالا / ہے جو بندھن سو مکڑی کا جالا
اپنے بندھن سے جو کہ چھوٹا ہے / ہم پہ گویا وہ بانس ٹوٹا ہے
کیا کہوں آہ گھر ہے کہنے کو / باندھتا ہوں مچان رہنے کو
بند چھانکوں کو کیجئے تا کے / یاں تو یک آسمان ٹوٹا ہے
ٹھیکی دینے کو جا رہے ہیں ہم / سر پہ ٹھٹھر لئے کھڑے ہیں ہم
ٹٹیاں تھیں جو آگے چھپّر کے / بہتی پھرتی ہیں صحن میں گھر کے

تا گلے سب کھڑے ہیں پانی ہیں — خاک ہے ایسی زندگانی ہیں

اب تو اپنا بھی حال بدتر ہے — سر پہ گٹھڑی ہے تپہ چھپر ہے

پانی پہ کر جھکا جو ہے دالان — سر پہ رہتا ہے طرۂ ایوان

چاک اس ڈول سے ہے ہر دیوار — جیسی چھاتی ہو عاشقوں کی فگار

متصل ٹپکے ہے نہ باراں ہے — گریۂ زار ہر سو گو اراں ہے

گھر کی صورت جو اور ہوتی ہے — چھت بھی بے اختیار روتی ہے

مینہ یکبارگی جو ٹوٹ پڑا — کڑی تختہ ہر ایک چھوٹ پڑا

داسے پایانِ کار ٹوٹ بہے — طاقچے بھر رہے بتے پھوٹ بہے

بہ گئے کولے تختے ڈوب گئے — غرض اجزائے سقف خوب گئے

موج خشتی ستون میں بیٹھی — جان غمناک خون میں بیٹھی

لے گیا پیچ و تاب پانی کا — کوٹھری تھی حباب پانی کا

یوں ڈھا گھر کہ بارِ خاطر تھا — آہ کس کا غبارِ خاطر تھا

اکھڑی دہلیز سب منڈیر گری — لہری پانی کی جھاڑو دیتی پھری

ساری بنیاد پانی سے نے کاٹی — اینٹ کے گھر کو کردیا ماٹی

جھک گئے سب ستون در بیٹھا — وہی چھپر کھڑا ہے گھر بیٹھا

جب اجارے پہ آکے چھت ٹھہری — ہم سبھوں میں یہ مصلحت ٹھہری

آؤ اب چھوڑ کر یہ گھر نکلیں — کسو ٹٹی پہ بیٹھ کر نکلیں

دب کے مرنے سے ڈوب مرنا خوب — ہے کنارا یہاں سے کرنا خوب

سنکے ہر اک کے جی میں ڈر آیا — خاطروں میں یہ حرف ٹھہرایا

گٹھڑی کپڑوں کی میں اٹھائی تھی — سر پہ بھائی کے چار پائی تھی

بوجھ کپڑوں کا جن نے باندھا تھا — اس کا سارا فگار کاندھا تھا

ساتھ کوئی چراغ لے نکلا | کوئی سر پر اجاغ لے نکلا
چھاج کی کر کے کوئی اوٹ چلا | منہ کے مارے کوئی لوٹ چلا
منہ پہ جھلنے کو ایک نے روپا | ایک نے سر کی کا کیا گھوپا
ایک نے چھینکے حال حال گئے | پائے پٹی گلے میں ڈال لئے
ایک نے بوریا لپیٹ لیا | اور پایا جو کچھ سمیٹ لیا
اپنا اسباب گھر سے ہم لے کر | الگنی سب کے ہاتھ میں دیکر
صف کی صف نکلی اس خرابی سے | تاکہ پہنچیں کہیں شتابی سے
میر جی اس طرح سے آتے ہیں | جیسے کنجر کہیں کو جاتے ہیں
جن نے اس وقت آنکھ کو کھولا | ہنس کے بے اختیار وہ بولا
سنکے اس بات کو ترائے ہم | بابے اک بھائی کے گھر آئے ہم
تب سے رہنے کو ابتلک ہیں خراب | نہیں ملتا ہے گھر بقدر حباب
جس میں خوش یک نفس معاش کریں | طور پر اپنے بود و باش کریں

مثنوی مسمّی بہ جوشِ عشق

ضبط کروں میں کبتک آہ اب | چل اے خامے بسم اللہ اب
کر ٹک دل کا راز نہانی | ثبت جریدہ میری زبانی
یعنے میر ایک خستہ غم تھا | سر تا پا اندوہ و الم تھا
آنکھ لڑی اس کی اک جا گہہ | بے خود ہو گئی جانِ آگہہ
صبر جا ہی دل سے رخصت | تاب نے ڈھونڈی یکدم فرصت

تاب و توان و شکیب و تحمل
رخصت اُس سے ہو گئے بالکل

سینہ فگاری سامنے آئی
بیتابی نے طاقت پائی

کرتے آئے داغ سیاہی
کام جگر کا کرنے تباہی

خونِ جگر ہو بہنے لاگا
پلکوں ہی پر رہنے لاگا

خواب و خورش کچھ کام نہ آیا
ایک گھڑی آرام نہ آیا

چاکِ جگر سے محبت ٹپکی
آنسو کی جاگہ حسرت ٹپکی

سوز سے چھاتی تابہ گویا
اور پلک خوننابہ گویا

آہ سے اُس کی مشکل جینا
درد فقط تھا سارا سینا

دل میں تمنا داغ جگر میں
شیون لب پر یاس نظر میں

نالے شب کو اُس کے سنکر
مر گئے کتنے سر کو دھن کر

آہ و فغاں ہے اُسکے لب پر
روز ہے ایک آفت شب پر[1]

روی و جبیں پہ خراشِ ناخن
داغوں سے خوں کے قامت گلبن

زخمِ سینہ دل تک پہنچا
کوئی نہ اِس گھائل تک پہنچا

آبلہ دل کا جب کوئی پھوٹا
فوّارہ لوہو کا چھوٹا

غم نے تو دل میں کیا ہے چھوڑا
پر میں تھا اِک پکّا پھوڑا

سونا گیا یکدم وہ بےکل
بخت نہ جاگے اسکے اِک پل

کام رہا ناکامی ہی سے
تسکیں بےآرامی ہی سے

رخساروں پر خون رواں ہو
دل میں ہو سو منہ پہ عیاں ہو

دشنۂ غم سے سینے کو کوچا
ناخن سے منہ سارا نوچا

دل آما جگہ غم تاکی
اور نفس اِک تیر ہوا کی

[1] کلیات میر مطبوعہ مطبع منشی نولکشور کانپور میں یہ مصرع اس طرح لکھا ہے ع۔ روز نئی اک آفت سب پر

نے طاقت نے یارا اُسکو — ضعفِ دلی نے مارا اُسکو
نالہ دل میں خونینی اُسکی — خاطر میں غمگینی اُس کی
رنگ اُڑے چہرے کا ہردم — تھا گویا گُلِ آخرِ موسم
دست بدل ہر آن رہے وُہ — بے طاقت بے جان رہے وُہ
رنگ شکستہ بسکہ فسردہ — کہنے کو زندہ لیکن مُردہ
خونباری سے چہرا گلگوں — حلق بسمل دیدۂ پُرخوں
حد دل جاری چاک گریباں — گوشۂ دامن وقفِ مژگاں
دیدۂ تر کے دریا قائل — ساحل خشک لبی کے سائل
ہر دم ہو ہر سمت کو جاری — خونباری سے سیلِ بہاری
تشنہ لبی اِک منہ پر پیدا — لب چش جس کا ہووے نہ دریا
خاک بسر آشفتہ سری سے — شورِ قیامت نوحہ گری سے
سرتاپا آشفتہ دماغی — داغِ جنوں دے جس کو چراغی
غم سے گرچہ دم بھی کہیں تھا — جامے میں اک تار نہیں تھا
وادی پر جب اپنی آوے — صحرا صحرا خاک اڑاوے
کلفتِ دل جب خاک فشاں ہو — اشک کے جاگہ ریگ رواں ہو
گل اُن نے از بسکہ کھائے — پھولوں کی چھڑیاں ہاتھ بنائے
دل کے غبار نے راہ جو پائی — شہر میں گویا آندھی آئی
سر پر اسکے سنگ ہمیشہ — جی پر عرصہ تنگ ہمیشہ
آہِ سرد کرے وہ عریاں — بید سا کانپے موئے پریشاں
گرد کی تہ اِس کا پیراہن — دامنِ صحرا جس کا دامن
بارِ دامن تارِ گریباں — دامن قرب و جوارِ گریباں

پامالی میں مثلِ جادہ ۔۔۔ نقشِ قدم سا خاک افتادہ
دشت تلک گئی آبلہ پائی ۔۔۔ دُور کھینچی اِس کی رسوائی
اُسکے جو پامال ہُوے سب ۔۔۔ خارِ بیاباں لال ہوے سب
جن نے دیکھا اس کو یک دم ۔۔۔ اُن نے کہا یہ بھول کے سب غم
چندے یہ ناشاد رہے گا ۔۔۔ پر مدت تک یاد رہے گا
جلنا اُس سے کرے نہ کنارا ۔۔۔ جیسے چراغِ وقف بچارا
لوہو ٹپکے آہِ سحر سے ۔۔۔ نالہ گنھواں لختِ جگر سے
رکھتا تھا سدا وُہ دیوانہ ۔۔۔ ورد زباں یہ شعر دانا
سَارَ فُؤَادِیْ شَقًّا شَقًّا ۔۔۔ حَقًّا حُقًّا حَقًّا حَقًّا
ہوش وخرد ناشاد گئے سب ۔۔۔ دین و دل برباد گئے سب
دردِ دل سے کچھ نہ کہے وہ ۔۔۔ ہر اک کا منہ دیکھ رہے وہ
حسرت اس کی ایک اعجوبا ۔۔۔ آبِ دہن کی موج میں ڈوبا
غیر سے بولے نہ یاروں ہی سے ۔۔۔ بات کہے تو اشاروں ہی سے
سمجھو تو کوئی داد کو پہنچو ۔۔۔ عاشق کی فریاد کو پہنچو
ورنہ رہے من مار کر اپنا ۔۔۔ سر دے مارے ہار کر اپنا
کیونکر غم سے ہو آزادی ۔۔۔ جان کے ساتھ اُس کی ناشادی
کوئی نہ اس پر سایہ گستر ۔۔۔ اپنا ہاتھ اپنے ہی سر پر
نے کعبے نے دیر کے قابل ۔۔۔ مذہب اُس کا سیر کے قابل

کیسا کہئے کیسا کچھ تھا
القصہ وہ ایسا کچھ تھا

مثنوی دربیان دنیا گوید

سنو اے عزیزانِ ذی ہوش و عقل — کہ اِس کارواں گہ سے کرنا ہے نقل
پیمبر ہے شہ ہے کہ درویش ہے — سبھوں کو یہی راہ درپیش ہے
کہو گے کہ آگے تھا کہتا کوئی — نہیں اِس سرا بیچ رہتا کوئی
بجا ہی کیا کوس رحلت مُدام — کہوں نے نہ بجتا سنا یاں مُقام
یہ بیٹھے جو ہیں سامنے ہیں کہاں — جہاں جملہ ہے ایک بزمِ رواں
جسے دیکھو چلنے کا گرمِ تلاش — یہ منزل نہیں جائے بود اور باش
گدا ہو کہ ہو شاہِ عالی تبار — تہ خاک سب کا ہے دارالقرار
نہ یک بوئے خوش ہی ہوا ہو گئی — وہ رنگینیٔ باغ کیا ہو گئی
ملے خاک میں جھڑ کے گلہائے تر — پریشاں ہوے مرغِ گلشن کے پر
پتنگوں نے گر خاک مسکن کیا — چراغوں نے بھی خانہ روشن کیا
گئی خاک دامن فشانی کے ساتھ — رہا آب سو بھی روانی کے ساتھ
رہی راکھ ہو کر اگر آگ تھی — رُکن ہے جہاں باؤ کی لاگ تھی
نہ جدول رہے گی نہ سرو رواں — گلستاں کو پاوینگے ہو کا مکاں
زمیں کار ہے گا یہی کیا سبھاؤ — لپٹ جائینگے آسماں جیسے تاؤ
سکوں یاں کا دیکھا سراسر شتاب — چلے جاتے ہیں کوہ جیسے سحاب
جہاں ایک ماتم سرا ہے عجب — نہیں جائے باش اور جا ہے عجب
بھلا جی کے جانے کا کیا ہے بیاں — عیاں ہے کہ کہتے ہیں جاں کو رواں
جوانی گئی موسمِ شیب ہے — شہو ایک دو روز کو عیب ہے

ہنسوں کیونکہ ہنستی ہیں دنداں نما ۔ کہ ہے جائے دنداں ہی دنداں نما
گیا شور سر سے جھکا ہے بہت ۔ گئی واشد اب دل رکا ہے بہت
نہ وہ ذائقہ ہے نہ وہ ہے مشام ۔ مزا کچھ نہیں ہو چکی صبح شام
بلا ارتعاشِ تنِ زار ہے ۔ ہر ایک عضو چلنے کو تیار ہے
ہوا حافظہ بسکہ نسیاں کا صرف ۔ نہیں یاد آتا ہے دوشینہ حرف
ہوئے شعر کیا کیا فراموش ہائے ۔ کہوں کیا گزرتی ہے خاموش ہائے
نہ پوچھو لب و لہجہ بے طور ہے ۔ سخن کرنے کا ڈھنگ ہی اور ہے
نہیں گور کے کام سے کچھ فراغ ۔ کسے ذوقِ صحبت کہاں ہے دماغ
نہ کچھ یوں ہی عینک نظر چڑھ گئی ۔ بصارت کی بے طاقتی بڑھ گئی
نہ رکھئے جو عینک نہ آوے نظر ۔ کہے تو کہ اعمیٰ ہیں ہم بے بصر
رہیں دیکھ جو حرف زن ہو حریف ۔ رہا سننے کی گوں نہ سمع شریف
صد افسوس لطف سماعت نہیں ۔ صدا دور سے جیسے آوے کہیں
شبابِ آہ داغِ جگر دے گیا ۔ قدِ خم زمیں کی طرف لے گیا
نہ کچھ زور بازو بہت کم ہوا ۔ جھکا سر سو زانو کا ہمدم ہوا
جوانی کی شب کیا بسر ہو گئی ۔ سفیدئ مو سے سحر ہو گئی
بدن زار اعضا سبھی رعشہ دار ۔ کرے کون خوباں سے بوس و کنار
جو یہ چال ہے جا رہے ہیں ہم اب ۔ دموں پر غرض آ رہے ہیں ہم اب
کھڑے ہوں تو تھرائے ران اور ساق ۔ جبیں بیٹھیں کیونکر کہ جینا ہے شاق
جو یوں پاؤں چلتے بچلتے رہے ۔ تو دیکھو گے ہم یاں سے چلتے رہے
اگر ضعف سے چپ ہی رہتے ہیں ہم ۔ یہ سوچو تو کیا کیا نہ کہتے ہیں ہم
کہے ہیں نہیں اپنے ٹک پا و دست ۔ کیا خاک میں مجھ کو پیری نے پست

جو باز وہیں اپنے سو باز وہیں — اگر منہ کو دیکھو تو وہ رد نہیں
بدن کی ہوئی میرے صورت ہی اور — وے آنکھیں نہیں وے نہ چتون کے طور
جسد ناتواں جائے مہمان تنگ — سخن منہ پر آوے دداعی کے رنگ
لبوں پر نہایت ضعیف ایک آہ — در و بام پر حسرتوں سے نگاہ
شکن جلد میں دل کو پژمردگی — غریزی حرارت میں افسردگی
برودت بہت جسم میں آگئی — مزاجی تھی گرمی سو ٹھنڈا گئی
چھڑکتا رہوں منہ پہ میں آب کاش — کہ ہوتا رہے روح کا انتعاش
وگرنہ دیا سا بجھا جائے ہے — پھر اُٹھ بیٹھوں تو جی چلا جائے ہے
سیہ روئے شیب اک ستم کر گیا — لکھوں کیا کہ میں جیتے جی مر گیا
قلم رکھ دے کر میر ختم کلام — تمام اپنی صحبت ہوئی والسلام

مناجات بطور عاشقانہ در بلائے جدائی گرفتار

مرا زخم یارب نمایاں رہے — پس از مرگ صد سال خنداں رہے
رہے دشمنی جیب سے چاک کو — صبا دوست رکھے مری خاک کو
مژہ اشک خونیں سے سازش کرے — غم دل بھی مجھ پر نوازش کرے
جگر سے تپیدن موافق رہے — مرا در دل مجھ پہ عاشق رہے
جو نالہ ہو شبگیر کا روشناس — وہ آٹھوں پہر ہی رہے میرے پاس
مژہ گرم افسوس نمناک ہو — کہ سیلاب آتش پہ خاشاک ہو
کرے نیزہ بازی یہ آہ سحر — کہ خورشید کی پھوٹ جائے سپر

خموشی سے مجھ کو رہے گفتگو | اڑے پر لگا کر مرا رنگ رو
نہ مرہم سے افسردہ ہو داغِ دل | شگفتہ رہے یہ گلِ باغِ دل
سدا چشمِ حیرت سے لپٹی رہے | مجھے دیکھ رہنے کی فرصت رہے
اگر ضعف ٹک کسبِ طاقت کرے | مری ناتوانی قیامت کرے
مری بیکسی نازبردار ہو | مردوں میں تو مرنے کو تیار ہو
بیاباں میں آشفتہ حالی کروں | کہیں تو دلِ پُر کو خالی کروں
کریں دورِ عالم ملامت مجھے | ڈبو دیوے اشکِ ندامت مجھے
مرا ہاتھ ہو چاک کا دستیار | کہ تا جیب و دامن ہوں قرب و جوار
جنوں میں مرے سر پہ سلامت رہے | بیاباں میں مجھ سے قیامت رہے
بھٹکنے سے مجھ کو نہ ہو وارہی | بھلا دے خضرؑ کو مری گمرہی
جو ہو گرم رہ پائے پُر آبلہ | تو ہو جائے سرد آتشِ قافلہ
ارے ساقی اے غیرتِ آفتاب | کہاں تک ہمیں خونِ دل کی شراب
کبھو ساغر و بادہ کا دید ہو | محرّم ہمارا کبھی عید ہو

در تعریفِ عشق خانماں آباد و ازادگانِ نانہاد

زہے عشق نیرنگ سازی تری | کہ ہے کھیلنا جی یہ بازی تری
تجھی سے ہے آبِ رخِ زرد زرد | تجھی سے مرے دل میں اٹھتا ہے درد
تجھے ربط کفار و دیندار سے | تجھے رشتہ تسبیح و زنار سے
تجھی سے ہے بلبل کو نوحہ گری | تجھی پر ہے قمری بھی خاکستری

ترا جذب دریا کو بہنے نہ دے ‌ ‌ ترا شور صحرا کو رہنے نہ دے
تجھی سے دلِ شاد غمناک ہے ‌ ‌ تجھی سے مرا سینہ صد چاک ہے
تمنا کو تو نے کیا ہے شہید ‌ ‌ تجھی سے نہ بر آئی میری امید
تجھی سے ہے مجنونِ صحرا نورد ‌ ‌ تجھی سے ہے فرہاد کوہوں پہ مرد
تجھی سے گلو بند ہے خستگی ‌ ‌ تجھی سے ہے وابستہ دلبستگی
تجھی سے دلِ عاشقاں ہے کباب ‌ ‌ تجھی سے ہے پروانہ آتش کا باب
ترا کام دینا ہے بدنامیاں ‌ ‌ تری ریجھ دیکھے ہیں ناکامیاں
تجھی سے سراسیمہ ہیں یار لوگ ‌ ‌ تری تیغ سے قیمہ ہیں یار لوگ
تجھی میں ہیں یہ کارپردازیاں ‌ ‌ تجھی پر ہیں موقوف جانبازیاں
مجھے اسکے چھپنے کا سودا رہا ‌ ‌ ولیکن ترا راز رسوا رہا
ہوا اپنا عاشق پیا ہی کئے ‌ ‌ ترے جرم پر جی دیا ہی کئے
ترا ہی نمک خوار ہے زخمِ دل ‌ ‌ کہ مرہم سے بیزار ہے زخمِ دل
تجھے اک ہے مژگاں سے یہ ربطِ اشک ‌ ‌ کہ مشکل ہوا ہے مجھے ضبطِ اشک
کدھر ہے تو لے ساقیٔ لالہ فام ‌ ‌ نہ لغزش ہے تجھ بن نہ بہکا کلام
کہاں تک کوئی خونِ دل کو پئے ‌ ‌ کوئی کیونکر اس رنگ ظالم جیئے

مثنوی مسمی بہ خواب خیال

خوشا حال اس کا جو معدوم ہے ‌ ‌ کہ احوال اپنا تو معلوم ہے
رہیں جانِ غمناک کو کاہشیں ‌ ‌ گئیں دل سے نومید سو خواہشیں

زمانے نے رکھا مجھے متصل
پراگندہ روزی پراگندہ دل

گئی کب پریشانیٔ روزگار
رہا میں تو ہم طالعِ زلفِ یار

وطن میں نہ اک صبح میں شام کی
نہ پہنچی خبر مجھ کو آرام کی

اٹھاتے ہی سر یہ پڑا اتفاق
کہ دشمن ہوئے سارے اہلِ وفاق

جلاتے تھے مجھ پر جو اپنا دماغ
دکھانے لگے داغ بالائے داغ

جدائی نے آوارہ چاہا مجھے
مری بیکسی نے نباہا مجھے

رفیقوں سے دیکھی بہت کوتہی
غریبی نے اک عمر کی ہمسری

مجھے یہ زمانہ جدھر لے گیا
غریبانہ چندے بسر لے گیا

بندھا اس طرح آہ بارِ سفر
کہ نہ زادِ رہ کچھ نہ یارِ سفر

دلِ اک یار سو بیقرارِ بتاں
غبارِ سرِ رہگزارِ بتاں

گرفتارِ رنج و مصیبت رہا
غریبِ دیارِ محبت رہا

چلا اکبر آباد سے جس گھڑی
در و بام پر چشمِ حسرت پڑی

کہ ترکِ وطن پہلے کیونکر کروں
مگر ہر قدم دل کو پتھر کروں

دلِ مضطرب اشکِ حسرت ہوا
جگر رخصتانے میں رخصت ہوا

کھچا سارے رہ دامنِ چاک دل
رہا بر قفا روئے غمناک دل

پس از قطع رہ لائے دلی میں بخت
بہت کھینچے یاں میں نے آزار سخت

جگر جور گردوں سے خوں ہو گیا
مجھے رکتے رکتے جنوں ہو گیا

ہوا خبط سے مجھ کو ربطِ تمام
لگی رہنے صحبت مجھے صبح و شام

کبھو کف بلب مست رہنے لگا
کبھو سنگ در دست رہنے لگا

کبھو غرقِ بحرِ تحیر رہوں
کبھو سر بجیبِ تفکر رہوں

یہ وہم غلط کاریاں تک کھنچا
کہ کارِ جنوں آسماں تک کھنچا

نظر رات کو چاند پر گر پڑی — تو گویا کہ بجلی سی دل پر پڑی
مہ چاردہ کارِ آتش کرے — ڈروں یا نتلک میں کہ جی غش کرے
تو تہم کا بیٹھا جو نقشِ درست — لگی ہونے وسواس سے جان سست
نظر آئی اک شکل مہتاب میں — کمی آئی جس سے خور و خواب میں
اگرچہ پرتو سے مہ کے ڈروں — و لیکن نظر اس طرف ہی کروں
ڈروں دیکھ مائل اسے اسطرف — بجدے کہ آجائیں ہونٹوں پہ کف
پڑی فکر جاں میرے احباب کو — اڑا دویں سب گھر کے اسباب کو
کوئی پاس کوئی تفاوت سے ہو — سراسیمہ کوئی محبت سے ہو
کوئی فرطِ اندوہ سے گریہ ناک — گریباں کسو کا مرے غم سے چاک
جو دیکھوں تو آنکھوں سے لوہو بہے — نہ دیکھوں تو جی پر قیامت رہے
کہے چشم بندی کو ہر بار غیر — و لے منزلِ دل میں اِس مہ کی سیر
وہی جلوہ ہر آن کے ساتھ تھا — تصوّر مری جان کے ساتھ تھا
اگر ہوش میں ہوں و گر بے خبر — وہ صورت رہے میرے پیشِ نظر
اسے دیکھوں جیدھر کروں میں نگہ — وہی ایک صورت ہزاروں جگہ
نگہ گردشِ چشم سے فتنہ ساز — مژہ آفتِ روزگارِ دراز
عجب رنگ پر سطحِ رخسار کا — مگر تھا وہ آئینہ گلزار کا
جو آنکھ اس کی بینی سے جا کر لڑے — دمِ تیغ پر راہ چلنی پڑے
مکاں کچھ لبِ خواہشِ جان کا — تبسّم سبب کاہشِ جان کا
دہن دیکھ کر کچھ نہ کہئے کہ آہ — سخن کی نکلتی تھی مشکل سے راہ
سزا ہے جگر اِس کسو کے لئے — جو سیبِ ذقن اس کا بو کر جیئے
گلِ تازہ شرمندہ اِس رو سے ہو — خجل مشکِ ناب اسکے گیسو سے ہو

سراپا میں جس جا نظر کیجئے — وہیں عمر اپنی بسر کیجئے
کہیں مہ کا آئینہ در دست ہے — کہیں بادۂ حسن سے مست ہے
کہیں نقشِ دیوار دیکھا اسے — کہیں گرم رفتار دیکھا اسے
کہیں دلبری اس کو در پیش ہے — کہیں مائلِ خوبیِ خویش ہے
کہیں جملہ تن مہر حرفِ سلوک — کہیں مجھ سے سرگرمِ حرفِ سلوک
لطافت سے یکجان ہووے تمیز — سبک سیر مانندِ عمرِ عزیز
کہیں جلوہ پرداز وہ عشوہ ساز — کہیں ایستادہ بصد رنگِ ناز
ہر اک جائے لے ناز سے وہ سبق — در و بام تصویر کا سا ورق
رہے سامنے اک طرح پر کبھو — رکھے وضع سے پاؤں باہر کبھو
کبھو صورتِ دلکش اپنی دکھائے — کبھو اپنے بالوں میں منہ کو چھپائے
کبھو گرم کینہ کبھو مہرباں — کبھو دوست نکلے کبھو خصمِ جاں
کبھو یک بیک یار ہو جائے وہ — کبھو دست بردار ہو جائے وہ
گلے میں مرے ہاتھ ڈالے کبھو — طرح دشمنی کی نکالے کبھو
کبھو چیں برابرو کبھو ہنسکے بات — کبھو بے وفائی کبھو التفات
جو میں ہاتھ ڈالوں تو واں کچھ نہیں — بجز شکل وہمی عیاں کچھ نہیں
ہر اک رات چندے یہ صورت رہی — اسی شکل وہمی سے صحبت رہی
دمِ صبح ہو گرم رہ سوئے ماہ — کہ در پیش آوے یہ روزِ سیاہ
کہ جھوما کروں بید مجنوں کی طرز — رہے یاد اس سرو موزوں کی طرز
رہوں زرد میں گاہ بیمار سا — پریشاں سخن گہ پریدار سا
پری خواں کو لا کوئی افسوں پڑھائے — کسو سے کوئی جا کے تعویذ لائے
طبیبوں کو آخر دکھایا مجھے — نہ پینا تھا جو کچھ پلایا مجھے

دوا جو لکھی سو خلاف مزاج
کھچا اِس خرابی کو کارِ علاج

کہ سر رشتۂ تدبیر کا گم ہوا
دل اوپر ہجومِ توہم ہوا

دروں خود بخود بے حواسی رہی
پریشاں دلی اور اداسی رہی

کروں بے کلی جاؤں تا ہر کہیں
نہ گھر میں لگے جی نہ باہر کہیں

قیامت جنوں کا رہے سر میں شور
کھچا جائے دل کوہ و صحرا کی اور

رہے شوق سر در گریبانِ دل
ہوا کھینچے صحرا کو دامانِ دل

سرِ آشفتہ زلفِ گرہ گیر کا
قدم حلقہ در گوشِ زنجیر کا

جنوں آہ درپے ہوا جان کے
مجوز ہوئے یار زندان کے

کیا بند اِک کوٹھڑی میں مجھے
کہ آتش جنوں کی مگر واں بجھے

لب نان اِک بار دینے لگے
دمِ آب دشوار دینے لگے

کہاں علم کا کسب فرصت نہ آہ
ہوا کا بھی واں گشت روزن کی راہ

نہ آوے کوئی ڈر سے میرے کنے
کہ کیا جانئے کیسی صحبت بنے

وہ آشفتہ سر ہوشمندی سے دور
نہیں رابطہ مقتضائے شعور

وہ حجرہ جو تھا گور سے تنگ تر
در اُس کا نہ کھلتا تھا دو دوپہر

جو اس میں کبھو میں سنبھل بیٹھتا
تو پھر بھی اکدم نکل بیٹھتا

سرِ شام بیٹھا تھا میں ایک روز
افاقت نہ آئی تھی مجھ کو ہنوز

کہ یاروں نے برجستہ تدبیر کی
مرے خون میں کچھ نہ تقصیر کی

اگرچہ دے کہنے سے خوں کم کیا
لیا لوہو اتنا کہ بیدم کیا

بڑی دیر تک خون جاری رہا
میں بیہوش وہ رات ساری رہا

جگایا سحر مجھ کو اِک شور سے
کھلی آنکھ میری بڑے زور سے

وہی دستِ فصاد میں نیشتر
وہی رنگ صحبت کا پیشِ نظر

وہی لوہو لینے کا ہنگامہ پھر — وہی تر لہو میں مرا جامہ پھر
لگی نشتر ایسی کہ لگتی نہیں — چبھے جیسے مژگاں کسو کے کہیں
ہوا خون سے دامن و جیب تر — رگِ جاں تلک زخم پہنچا مگر
ٹپکتا رہا دیر تک خونِ ناب — مجھے لے گئی بیخودی کی شراب
سخن ضعف سے سخت دشوار تھا — پلک کا اٹھانا بھی اک بار تھا
کئی روز بالیں پہ یہ سر رہا — خمار ایک مدت تلک پھر رہا
کھڑا ہوں اگر پاؤں لغزاں ہے — بدن بید کی طرح لرزاں رہے
چلا جائے سر پاؤں تھر تھر کرے — نسیمِ سحر کا صرصر کرے
جفا ضعف سے مجھ کو کیا کیا نہ تھی — افاقت گئی یوں کہ گویا نہ تھی
پس از چند آنکھیں ٹھہرنے لگیں — نگاہیں بھی کچھ کام کرنے لگیں
بندھانا توانی کا رختِ سفر — کیا طاقتِ رفتہ نے منہ ادھر
کسے تھا مری زندگی کا دھیان — ولیکن نہایت تھا میں سخت جان
لگی جان سے آنے اعضا کی بیچ — کوئی روز رہنا تھا دنیا کے بیچ
پھرانا توان میں بہت دور سے — کہ نزدیک تھا عالمِ گور سے
غلط کاریِ وہم کچھ کم ہوئی — وہ صحبت جو رہتی تھی برہم ہوئی
وہ صورت کا تھا وہم دیوانگی — لگی کرنے درپردہ بیگانگی
پس از دیر آنکھوں میں آنے لگی — نہ دو دو پہر منہ لگانے لگی
نہ دیکھے مری اور اس پیار سے — غریبانہ سر مار دے دیوار سے
کہیں ٹک تسلی کہیں بے قرار — کہیں شوق سے میرے بے اختیار
کہیں واسطے میرے روتی ہے خوں — کہیں دست زیرِ زنخ ہے ستوں
کہیں دل کو اپنے دکھاوے مجھے — مری بے وفائی جتاوے مجھے

کہیں دست بردل وہ رشکِ قمر — کہیں حسرت آلودہ مجھ پہ نظر
کہیں بے دماغانہ سرگرمِ ناز — کہیں آتشِ شوق سے جاں گداز
کہیں چشمِ گریاں سے دامان چاک — کہیں سوجگہ سے گریبان چاک
کہیں کامِ دل کی شکایت سی ہے — کہیں نقشِ دیوارِ حیرت سی ہے
کہیں مجھ سے کہتی ہے رخصت مجھے — کہ مطلق نہیں غم کی طاقت مجھے
کہیں لب پہ وہ شکوۂ خونچکاں — کہ پکار کرے جس سے آزارِ جاں
کہیں وہ نگہ جس سے یہ پائیے — کہ یہ دردِ دل ہے تو مر جائیے
کہیں وہ روش جس سے نکلے عتاب — کہیں وہ طرح جس سے رہئے خراب
کہیں حرف زن اِس طرح ناز سے — کہ دیکھا گیا دل کس انداز سے
کہیں وہ ادا جس سے معلوم ہو — کہ جیسے وہ عاشق کہ محروم ہو
کہیں وہ سخن جو جگر خوں کرے — کہیں طرز ایسی کہ مفتوں کرے
کہیں وضع ایسی کہ بیگانہ ہے — کہیں آشنا ہے تو دیوانہ ہے
کسو جا ہے جلوے میں اس آن سے — کہے تو کہ بیزار ہے جان سے
کسو وقت اس کا یہ اسلوب ہے — کہ شرمِ محبت سے محجوب ہے
کبھو بے قراری ہے اِس رنگ سے — [redacted]رتی ہے سر مارتی سنگ سے
کبھو بے ادائی و دشنام ہے — کبھو باؤ کے ہاتھ پیغام ہے
کہ اے بے وفا آہ دل نرم کر — محبت کے بھی منہ سے کچھ شرم کر
کبھو وہ تبختر کہ پروا نہیں — کبھو کیونکہ کہئے کہ سودا نہیں
کبھو یہ سخن جس سے ہو مستفاد — کہ اے بے وفا حرفِ من یاد باد
کہ ظاہر میں میرؔ اب تو آنا گیا — کہ وہ دوستی کا زمانا گیا
غرض نا امیدانہ کر اک نگاہ — وہ نقشِ تو ہم گیا سوئے ماہ

نہ آیا کبھو بھر نظر اس طرح
نہ دیکھا اُسے جلوہ گر اُس طرح

مگر گاہ سایہ سا مہتاب میں
کبھو وہم سا عالمِ خواب میں

دلِ خود پذیر وصالِ دوام
رہے خواب میں روز و شب صبح و شام

اگر وصل خوابِ فراموش تھا
ولیکن وہی خواب کا جوش تھا

پلک سے پلک آشنا ہے وہی
زخود رفتگی کی ردا ہے وہی

کھڑا ہوں تو سوتا ہوں اک ذوق میں
رگِ خواب دل ہے کفِ شوق میں

جو بیٹھا ہوں خوابِ گراں ہے مجھے
وہ غفلت جہاں در جہاں ہے مجھے

خیال اس کا آئے کہ سُن ہو رہوں
تلے سر کے پتھر رکھوں سو رہوں

مجھے آپ کو یونہی کھوتے گئی
جوانی تمام اپنی سوتے گئی

دکھایا نہ اُس مہ نے رو خواب میں
نہ دیکھا پھر اُس کو کبھو خواب میں

بہت بیخود و بے خبر ہو چکا
ہم آغوشِ طالع بہت سو چکا

نہ دیکھا کبھو میر پھر وہ جمال
وہ صحبت تھی گویا کہ خواب و خیال

تمت بالخیر

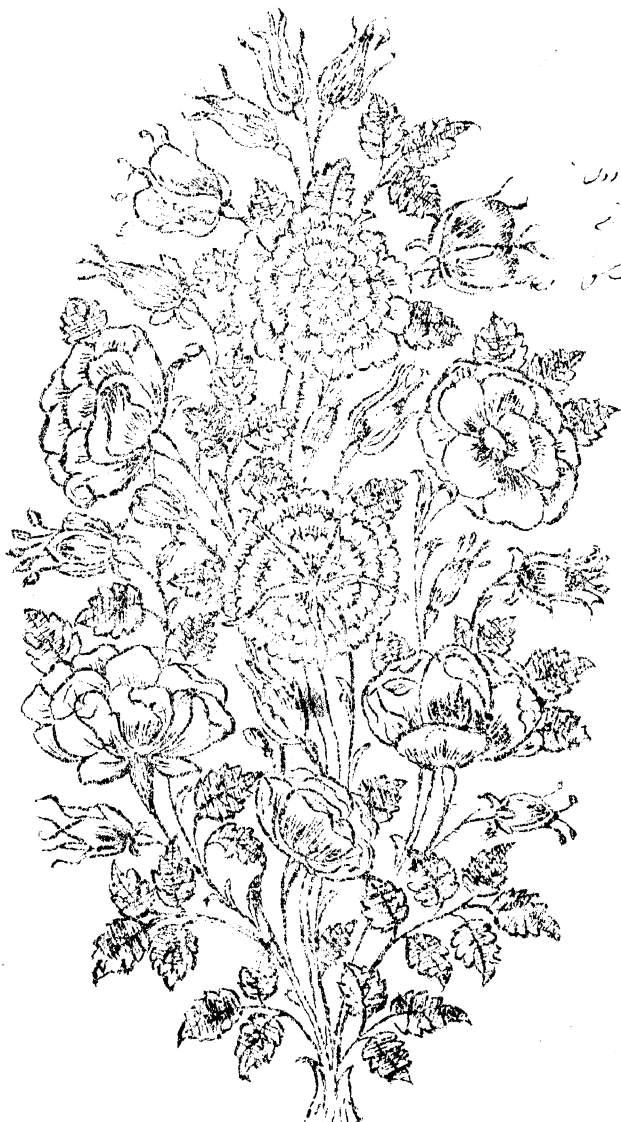

تاریخ تمدن حصہ اول یہ سر ٹامس بکل کی مشہور آفاق کتاب کا ترجمہ ہے اس میں تمدن کی ابتدائی تعریف سے لیکر انتہا تک ہر مسئلہ پر بے نظیر قابلیت اور عدیم المثال وسعت نظر کے ساتھ بحث کی گئی ہے یہ کتاب ہمیں واقعات پر غور کرنا اور اُن سے صحیح نتایج کا اخذ کرنا سکھاتی ہے مصنف نے انسانی تمدن کے متعلق عجیب و غریب اصول قایم کئے ہیں اور بڑی پر زور بحثیں کی ہیں اور اپنے اصول و کلیات کی شہادت و حمایت میں تاریخی واقعات کے انبار لگا دیے ہیں - قیمت غیر مجلد عہ

فلسفہ جذبات (از مولوی عبدالماجد صاحب بی اے) نفسیات (یعنے سایکالوجی) پر اردو زبان میں یہ پہلی کتاب ہے اسمیں نفسیات کے صرف ایک حصے یعنے جذبات و احساسات انسانی پر بحث کی گئی ہے باوجودیکہ یہ علمی کتاب ہے مگر بہت دلچسپ اور مفید ہے اور اس کا مطالعہ کرنا ہمارے ہموطنوں کے لئے نہایت ضروری ہے یہ کتاب ۱۴ ابواب پر شامل ہے آخر میں تقریباً ۱۵۰ مصطلحات کی فہرست معہ انگریزی کے دی ہے ملک کے علما اور اخبارات نے کتاب کو بہت پسند کیا ہے قیمت مجلد عہ

مقدمات الطبیعات (ترجمہ مولوی مرزا مہدی خانصاحب کوکب) یہ کتاب انگلستان کے مشہور سائنس داں اور حکیم ہکسلی کی کتاب کا ترجمہ ہے اسمیں مظاہر فطرت کا بیان ایسے عالمانہ انداز اور جامعیت کے ساتھ کیا گیا ہے کہ اور کسی اردو کتاب میں ملنا محال ہے کتاب بڑی تقطیع کی ۳۰۰ صفحات پر ہے کتاب کے آخر میں ایک طویل فہرست اُن مصطلحات کی ہے جو اس کتاب میں مستعمل ہوئے ہیں اور اُن کے مقابل اردو مرادفات درج ہیں - قیمت غیر مجلد عہ

البیرونی (مولفہ مولوی سید حسن صاحب برنی ایم اے) ابوریحان بیرونی اُن بلند پایہ اور عالی رتبہ حکما میں سے گزرا ہے جس پر ایک دنیا کو ناز ہے اس فضل روزگار نے مختلف مباحث و علوم پر سو سے اوپر کتابیں لکھی ہیں اور اکثر سائنس و ریاضیات کے نہایت دقیق اور اعلیٰ ... ہندوستان میں آکر اُس

نے سنسکرت میں اعلیٰ دستگاہ حاصل کی اور ہندوستان کے فلسفہ و تاریخ و مذہب و معاشرت پر ایک بے مثل کتاب لکھی جو اب تک وقعت و عزت کے ساتھ دیکھی جاتی ہے غرض یہ کتاب اسی فاضل متبحر کے حالات اور اس کی نادر و نایاب تصانیف اور کمالات پر ہے ضخامت ۱۰۰ صفحات قیمت مجلد عمہ

فلسفۂ اجتماع

(تالیف مولوی عبدالماجد صاحب بی اے) یہ کتاب بھی فلسفۂ جذبات کے قابل مصنف کے قلم سے نکلی ہوئی ہے اور نفسیات کے ایک عجیب مسئلہ سے بحث کرتی ہے اس کا موضوع نفس اجتماعی یعنے جماعت کے اعمال و قوائے دماغی کی تحلیل و تشریح ہے یہ کتاب فلسفۂ جذبات سے بھی زیادہ دلچسپ پیرائے میں لکھی گئی ہے آج کل جبکہ ملک میں ہر طرف سے قومی زندگی میں انقلاب کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں اس کتاب کا مطالعہ خاص طور پر مفید اور سبق آموز ہے اس پر ہندوستان و انگلستان کے علاوہ اخبارات نے اچھے اچھے ریویو لکھے ہیں [illegible] مجلد ۱ ضخامت (۲۳۶)

باغِ لطافت

یہ ہندوستان کے مشہور اور فصیح البیان شاعر میر انشاء اللہ خاں کی بے مثل کتاب ہے یہ پہلی کتاب ہے جو اردو [illegible]ن کی تحقیق و محاورات و الفاظ و صرف و نحو پر اس خوبی اور جامعیت کے ساتھ لکھی گئی اور اب تک یہ اپنی خوبیوں کی وجہ سے بے نظیر سمجھی جاتی ہے اس میں اس زمانے کی مختلف بولیاں خاص خاص محاورات اور عورتوں کی زبان اور انکے الفاظ بھی درج ہیں اور بعض عجیب عجیب نکات زبان کے متعلق پائے جاتے ہیں یہ کتاب جو بالکل نایاب تھی اب انجمن نے چھپوائی ہے قیمت عمہ مجلد عمہ

قاعدہ و کلید قاعدہ

قاعدہ بالکل جدید طرز پر لکھا گیا ہے اور اس میں اُن تمام نقائص کو رفع کیا گیا ہے جو موجودہ طرز تعلیم میں پائے جاتے ہیں انجمن نے یہ قاعدہ ایک مدت کے غور و خوض کے بعد ترتیب دیا ہے اور اردو کی ابتدائی نوشت و خواند کو بہت سہل کر دیا ہے اور جن اصول اور طریقہ پر اسکی تعلیم ہونی چاہیے اُن کے ہدایات کیلئے کلید بھی بنا دی ہے قیمت قاعدہ [illegible] کلید قاعدہ

آخری درج شدہ تاریخ پر یہ کتاب مستعار
لی گئی تھی مقررہ مدت سے زیادہ رکھنے کی
صورت میں ایک آنہ یومیہ دیرانہ لیا جائے گا۔

18 FEB 1954
11 DEC 1954
14 SEP 1955
23 NOV 1956
7 DEC 1960
21 DEC 1956
5 JAN 1957
2 DEC 1957
17 DEC 1957

16/562